تذکار الاسلام

پروفیسر محمدؐ عبداللہ

ناشر

پاکستان اکیڈمی

۱۴- عبدالغنی ر

ڈھاکا

اشاعت اول ستمبر ۱۹۷۱ء

قیمت [illegible] روپے Rs.

بنگالی شعراء - سوانح

طابع

سیّد محمد عالم

ستارہ پاکستان پریس

۴- قاضی عبدالرؤف روڈ

ڈھاکا -

۲۲۵۰/۹/۷

نذرُالاسلام

ڈاکٹر عندلیب شادانی

تعارف

اُردو میں نذرُالاسلام کے متعلق مضامین تو بہت سے لکھے جاچکے ہیں لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے اِس موضوع پر کوئی جامع اور مستقل تصنیف موجود نہیں۔ اُردو میں نذرُالاسلام کی زندگی اور شاعری پر قلم اُٹھانے والے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی مادری زبان بنگلہ ہو۔ وہ اُردو میں اچھی دستگاہ رکھتا ہو۔ بھرپور ادبی ذوق کا مالک ہو اور اُردو ادب سے بخوبی واقف ہو۔ پروفیسر عبداللہ ان تمام خوبیوں کے جامع ہیں۔ ان کی مادری زبان بنگلہ ہے۔ وہ اُردو میں اعلیٰ ڈگریاں امتیاز کے ساتھ حاصل کر چکے ہیں اور بہت اچھا ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ ان کی یہ کتاب "نذرُالاسلام" درحقیقت اہلِ وطن کے لئے ایک نادر تحفہ ہے۔

بنگلہ زبان نہ جاننے کی بنا پر جو لوگ براہِ راست نذرُالاسلام کے کلام کا مطالعہ نہیں کر سکتے وہ کئی قسم کی غلط فہمیوں کا شکار ہوئے ہیں۔ اُن کے علاوہ ایسے لوگ بھی جن کی مادری زبان بنگلہ ہے لیکن انہوں نے نذرُالاسلام کا مطالعہ سرسری طور پر کیا ہے یا اپنے ذاتی رجحانات اور معتقدات کی بنا پر وہ نذرُالاسلام کی شاعری کا صرف ایک ہی رُخ دیکھ سکے انہوں نے بھی نذرُالاسلام کو موردِ الزام ٹھہرایا ہے۔

یوں تو الزامات کی فہرست خاصی طویل ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ تین الزام زیادہ اہم ہیں:

ایک یہ کہ نذرُالاسلام کی شاعری ہندو تہذیب و تمدن کا مرقع ہے۔ اس پر ہندو

صنمیات و روایات کی گہری چھاپ ہے۔
دوسرا یہ کہ نذرُالاسلام متحدہ قومیّت کے حامی ہیں۔
تیسرا یہ کہ جہاں تک اعتقادات کا تعلق ہے، نذرُالاسلام اپنی شاعری میں مسلمان سے زیادہ ہندو ہیں۔ بنگلہ زبان کے ایک نامور عالم نے جو بنگالی بھی ہیں اور پاکستانی بھی، اپنی ایک تقریر میں یہاں تک فرمایا کہ نذرُالاسلام کو مسلمان کہنا یا مسلمان سمجھنا بزرگی ہے۔ جو شخص خدا کے سینے پر لات مارنے کی جرأت کر سکتا ہے وہ مسلمان کیونکر ہو سکتا ہے۔
جہاں تک پہلے اعتراض کا تعلق ہے، اس کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ نذرُالاسلام نے ایک ہندی کی حیثیت سے اہلِ وطن کے ہر طبقے کے خیالات کی ترجمانی اور ان کی روایات کی عکاسی کی ہے۔ اس کی بنا پر اُنھیں ہندو صنمیات اور ہندو روایات کا پرستار کہنا سراسر زیادتی ہے۔ اردو والوں کے سامنے تو میاں نظیر اکبر آبادی کی مثال موجود ہے۔ میاں نظیر اکبر آبادی نے ہولی۔ دیوالی جنم کنہیّا جی، کنہیّا جی کا بالپن۔ کنہیّا جی کی بانسری، کنہیّا جی کا لہو ولعب۔ کنہیّا جی کی شادی۔ کنہیّا جی کی راس۔ بلدیو جی کا میلا۔ درگا جی کے درشن۔ بھیروں کی تعریف۔ مہا دیو کا بیاہ، اور اسی قسم کے بہت سے موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں لیکن ان نظموں کی بنا پر انہیں کبھی کسی نے نہ ہندو کہا نہ ہندو سمجھا۔ وہ ہندو تیوہاروں، ہندو دیوتاؤں اور دیوتاؤں کی تعریف کرنے کے باوجود بھی مسلمان ہی رہے۔
رہا دو قومی نظریہ کا سوال۔ تو کیا شروع میں مولانا محمد علی جوہر اور مولانا حسرت موہانی جیسے مجاہدانِ ملّت بھی کانگریس کے رفیق اور متحدہ قومیت کے حامی نہ تھے۔ کیا قائدِ اعظم کی قوم پرستی کا آغاز کانگریس کی رکنیت سے نہیں ہوا تھا۔ کیا علاّمہ اقبال نے ترانۂ ہندی اور نیا شوالہ لکھ کر متحدہ قومیّت کا راگ نہیں الاپا تھا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اگر ۱۹۴۱ء میں نذرُالاسلام کا دماغی توازن درہم برہم نہ ہو گیا ہوتا وہ بھی ہندوؤں کی دھاندلی سے متاثر ہو کر انجام کار دوسرے اکابرِ ملّت کی طرح پاکستان کے حامی نہ بن جاتے۔
یہ بات خصوصیت کے ساتھ قابلِ غور ہے کہ نذرُالاسلام نے سیاسی طور پر متحدہ

قومیت کی حمایت کرنے کے باوجود اسلام کو ہر دوسرے مذہب سے اور مسلمان کو ہر دوسرے مذہب کے پیرو سے افضل و برتر جانا اور ملّت اسلامیہ کی امتیازی شان کا ہمیشہ دھڑلے سے اعلان کیا۔ ذرا ان کی کتاب "بلبل" کے یہ الفاظ دیکھئے۔ مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں

ہم اسی ملّت کے افراد ہیں جو مذہب کی راہ میں تمہید دیتے ہیں۔
ہم وہی ملّت ہیں۔ ہم ہی مساوات اور میل محبّت کو وجود میں لاتے ہیں۔
ہمیں لوگوں نے ساری دنیا کو اپنا سمجھا ہے۔
ہم وہی ملّت ہیں۔ ——— ——— ———

اگلی منیا میں ان کی اور نظم "کھیا پار پڑ رنی" (پار اترنے کی کشتی) نہ صرف ادبی حیثیت سے بلکہ مذہبی اعتبار سے بڑی معرکۃ الآرا چیز ہے۔ جی نہیں مانتا کہ اُسے نقل کئے بغیر آگے بڑھ جاؤں۔ سنئے:

۱ رات کے وقت مسافر پار اُترنے آئے ہیں۔
پھر یہ کڑکا کہاں سے آرہا ہے؟
کون تباہی کا صور پھونک رہا ہے؟
شمالی مغربی کونے میں تیز ہوائیں چل رہی ہیں۔
ابر آلود آسمان گرج رہا ہے۔

پُرخطر سمندر میں تیز ترنگیں ناچ رہی ہیں۔
موت کی مستی اپنی ہیبت ناک صورت میں ہے۔
کالی رات ساری کائنات کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے۔
کشتی کے تمام بے توشہ گنہگار ڈر سے کانپ رہے ہیں۔

یہ قیامت خیز رات تیرہ و تار ہے۔
کشتی پار لگنے کی کوئی اُمید نہیں۔
تمام مسافر ڈوبنے لگے ہیں۔
ٹھہر ٹھہر کر آسمان گونج رہا ہے۔ بجلی کوندہی ہے۔

پھر یہ کس کی کشتی ہے جو متلاطم سمندر کی تباہی۔
اس کی ہیبت ناک گرج۔
اور اس کی ہلاکت خیز طغیانی کو ہیچ سمجھ کر۔
بےفکری سے آگے بڑھتی چلی جارہی ہے۔

راہِ راست کے یہ مسافر معصوم ہیں۔
مذہب کی زرہ میں ان کے صاف دل بخوبی محفوظ ہیں
یہ بجلی کی تباہی سے کبھی خوف زدہ نہیں ہوتے۔
اس کشتی کے ناخدا احمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔
یہ کشتی زادِ راہ سے بھرپور ہے۔

ابوبکرؓ۔ عثمانؓ۔ عمرؓ۔ علی حیدرؓ۔
اس کشتی کے چپّو چلانے والے ہیں۔
اس کے لئے کوئی خوف وخطر نہیں۔
اس کشتی کا ناخدا آزمودہ کار ہے۔
یہ چپّو چلانے والے ہمنوا ہو کر "لاشریک لہٗ" کے گیت گائے جاتے ہیں۔

اس کشتی کے مستول پر شفاعت کا بادبان بندھا ہوا ہے۔
اس پر جنّت کی حوریں ڈھیروں پھول برسا رہی ہیں۔
یہ حوریں متواضع ہیں۔ ان کی نگاہیں اُلفت بار ہیں۔
یہ ہستیاں خیر و برکت کے مجسّمے ہیں۔
پار اُترنے والے مسافرو!
تم ہمنوا ہو کر بآوازِ بلند "لاشریک لہٗ" کے گیت گائے جاؤ۔
سمندر کی تباہی اور ابر آلود آسمان ان مسافروں کو خواہ مخواہ ڈرا رہا ہے
لو! راہِ راست کے یہ مسافر دریا پار ہو گئے۔

پروفیسر عبداللہ کے الفاظ میں۔

"اس نظم میں شاعر نے حصولِ نجات کو کشتی پار لگنے سے، حضرت محمد صلعم کو کشتی کے ناخدا سے، خلفائے راشدین کو چپو چلانے والوں سے، عام مسلمانوں کو کشتی کے مسافروں سے اور منزلِ مقصود تک پہنچنے کی دشواریوں کو پُر خطر سمندر کے شدائد سے تشبیہ دی ہے۔ اس نظم کا بنیادی خیال یہ ہے کہ مذہب اسلام ہی راہِ نجات ہے۔ رسول کریم صلعم اور صحابہ کرام کے متّبعین تمام مصائب و شدائد پر قابو پالیں گے۔ انھیں قیامت کے دن رسولِ کریم کی شفاعت نصیب ہوگی اور ان کا انجام بخیر ہوگا۔"

اب تو آپ کو کچھ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ہندو دیومالا کے گیت گانے والا نذرُ الاسلام ہندو مت کا پجاری ہے یا اسلام کا پرستار۔ نذرُ الاسلام کی ایک نظم اور پڑھ لیجیے کہ انھوں نے توحید، رسالت، ایمان، اسلام اور اس کی اخوت و مساوات کو کس دھوم سے، کس شان سے، کس وضاحت سے بیان کیا ہے۔

اللہ میرا رب ہے پھر مجھے کیا خوف؟
محمد صلعم میرے نبی ہیں جن کی دنیا بھر میں ثنا خوانی ہو رہی ہے
مجھے کیا ڈر ہے؟

قرآن میرا ڈنکا ہے۔
اسلام میرا مذہب ہے۔
اسلام ہی میری پہچان ہے۔

کلمۂ طیبہ میرا تعویذ ہے۔ توحید میرا مرشد ہے۔
ایمان میرا راہ ہے۔ ہلال میری ضیا ہے۔
نعرۂ اللہ اکبر میرا اعلانِ جہاد ہے۔
میری منزلِ مقصود عرشِ بریں کی فردوس ہے۔

عرب ہو یا مصر، چین ہو یا ہند، سارا جہاں میرا بھائی ہے
کوئی اعلیٰ اور کوئی ادنیٰ نہیں۔ یہاں سب برابر ہیں۔
مختلف قالبوں میں ایک ہی روح کارفرما ہے۔

امیر اور فقیر سب برابر ہیں۔
میں بیک تکبیر جاگ اُٹھتا ہوں۔
میری کامیابی یقینی ہے۔

یہ ہے نذر الاسلام کا مذہبی عقیدہ جس کا وہ علی الاعلان اعتراف کرتا ہے اور یہ ہے وہ نذر الاسلام جو بعض "علما" کے نقطۂ نظر سے مسلمان کہلانے کا مستحق نہیں۔

"نذر الاسلام" اُردو میں پہلی کتاب ہے جس میں نذر الاسلام کے حالاتِ زندگی جامعیت کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں اور اُن کے ذہنی ارتقا اور شاعری کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ پروفیسر عبداللہ نے جا بجا نذر الاسلام اور علامہ اقبال کا موازنہ کیا ہے۔ دونوں کے خیالات کی یکسانی واقعی حیرت انگیز ہے اور اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ جس طرح علامہ اقبال کی شاعری رہروانِ ملت کے لیے بانگِ درا ثابت ہوئی اسی طرح نذر الاسلام کی للکار بنگال کے

مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا سبب بنی۔

مصنف نے ایک باب میں اقبالؔ ٹیگور اور نذرُالاسلام تینوں کا موازنہ کیا ہے۔ یہ موازنہ دلچسپ بھی ہے اور فکر انگیز بھی۔

نذرُالاسلام نے بنگلہ شاعری کو اسلامی تہذیب و تمدّن اور اسلامی روایات کا آئینہ بنا دیا اور وہ بنگلہ میں اُردو غزل کی بحروں کو رواج دے کر نیز اُردو فارسی اور عربی کے الفاظ کا آزادانہ استعمال کر کے بنگلہ کو اُردو کے بہت قریب لے آئے۔

نذرُالاسلام پورے برِّ عظیم پاک و ہند میں ایک باغی شاعر کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ وہ اس لقب کے سزاوار بھی ہیں۔ ان کی سیاسی شاعری صرف نعرہ بازی نہیں بلکہ ایک برقی رَو ہے جو اپنے اندر قلب کو گرمانے اور روح کو تڑپانے کی زبردست صلاحیت رکھتی ہے۔

جس طرح اُن کی غنائی شاعری کیف و اثر اور ندرت و حسن کے اعتبار سے قدر کے قابل کی چیز ہے اسی طرح ان کی مذہبی شاعری میں بھی جذبۂ دینی اور حرارتِ ایمانی کے شعلے جا بجا بھڑکتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ان تمام کیفیات کو پروفیسر عبداللہ نے بڑی خوبصورتی اور کامیابی کے ساتھ اپنی تحریر کی گرفت میں لے لیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے نذرالاسلام کی صحیح تصویر قارئین کے سامنے آجائے گی اور بنگلہ نہ جاننے والے اُردو داں بھی ان کی شاعری کی قدر و قیمت کا ایک خاصی حد تک صحیح اندازہ لگا سکیں گے اور نذرُالاسلام کے متعلق وہ تمام غلط فہمیاں جو بیشتر ناواقفیت کی بنا پر لوگوں میں پھیلی ہوئی ہیں، دُور ہو جائیں گی۔

مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کے مطالعے کے بعد اقبال کی طرح نذرالاسلام کے متعلق بھی ہر مسلمان یہی محسوس کرے گا کہ وہ کسی ایک کا نہیں ہم سب کا ہے۔ پروفیسر عبداللہ کی یہ کوشش صرف زبان و ادب ہی کی نہیں بلکہ ملک و ملت کی خدمت ہے۔

ڈاکٹر قاضی دین محمد

پیشِ لفظ

قاضی نذرُالاسلام شاعرِ حبِّ وطن — اور شاعرِ بغاوت کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ انہوں نے تحریکِ آزادی میں صورِ انقلاب پھونک کر قوم کو خوابِ غفلت سے جگایا ہے۔ جہادِ زندگی میں فتح و نصرت کا مژدہ سُنا کر اُسے برسرِ پیکار لا کھڑا کیا۔ شدّتِ جذبات سے ان کا شاعرانہ تخیل کہیں بھی مجروح نہیں ہوا۔ خوش قسمتی سے قوم کی زندگی میں کبھی کبھار ایسی ذہانت کی مالک دو ایک ہستیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ہمارے اُفقِ ادب پر شہابِ ثاقب — اور دُمدار ستارے کی طرح طلوع ہو کر نذرُالاسلام نے فضا کو چمکا دیا ہے۔ ان کے جذبات و خیالات قوم کو ہمیشہ گرماتے رہیں گے۔ وہ بیک وقت شاعر بھی ہیں اور موسیقار بھی۔ ناول نگار بھی ہیں اور ناٹک نگار بھی۔ مقالہ نگار بھی ہیں اور صحافت نگار بھی۔ ان کے نغموں کی تعداد تین ہزار سے زیادہ ہے۔ شاید ہی دُنیا کے کسی اور شاعر نے اتنے گانوں کی تصنیف کی ہو۔

نذرُالاسلام ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ ہندوستان کی ہندی، اوڑھیا اور دوسری کئی زبانوں میں ان کی بعض نظموں کے تراجم شائع ہو چکے ہیں۔ پاکستان میں اُردو اور پشتو میں ان کی نظم و نثر کے ایک معتدبہ حصّہ کا ترجمہ وجود میں آیا ہے۔ دوسرے ممالک میں بھی ان کی شاعری کے ایک حصّے کو انگریزی، روسی اور سوئز زبان کا لباس پہنایا گیا ہے۔ جس طرح رابندر ناتھ ٹیگور کو ان کی مترجم (انگریزی) "گیتانجلی" نے مغرب بلکہ پوری دُنیا میں شہرت بخشی اسی طرح نذرُالاسلام کو بھی بڑی حد تک ان کی نظموں، گیتوں اور غزلوں کے تراجم ہی نے شہرۂ آفاق بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غیر بنگالی قارئین کے لئے معدودے چند مترجم نظموں، گیتوں اور

رلوں کے سوا نذرُالاسلام سے پوری واقفیت حاصل کرنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں بنابریں
مختلف زبانوں میں وسیع پیانہ پر ان کی متنوّع تخلیقات کا ترجمہ وجود میں آنا ضروری ہے۔

بنگلہ میں نذرُالاسلام کے شعروادب پر کئی ایک کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مگر جہاں تک ہماری
دانست کا تعلق ہے پاکستان کی کسی اور زبان میں آج تک اس پر کوئی مکمل تصنیف وجود میں
ہیں آئی۔ انھیں مغربی پاکستان کے اُردو بولنے والوں سے روشناس کرانے کی ذمّہ داری
ہم پر عائد ہے۔ پروفیسر محمد عبداللہ نے اُردو میں نذرالاسلام کے ادبی کارناموں پر "نذرالاسلام"
کے عنوان سے ایک تنقیدی کتاب لکھ کر ہمیں بڑی حد تک اس ذمّہ داری سے سبکدوش کر دیا ہے۔

یوں تو پروفیسر صاحب نے نذرُالاسلام کی شاعری کی روح کو اُجاگر کرتے ہوئے کم و بیش
ان کی شاعرانہ زندگی کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے مگر ان کی تنقید و تبصرہ میں شاعر کے اسلامی
جوش، وطن دوستی اور بغاوت کا پہلو زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ نذرُالاسلام کی حبُّ الوطنی اور ملت
دوستی کے بیان میں مصنف نے کسی طرح کی مبالغہ آمیزی نہیں کی۔ ان کا زورِ بیان سادہ انداز
اور غور و فکر قابلِ تعریف ہے۔

نذرُالاسلام کو اُردو بولنے والوں سے روشناس کرانے کی یہ پہلی جامع کوشش ہے
اس سے پاکستان کے ایک خطۂ عظیم کے لوگوں کو شاعرِ موصوف، ان کے ماحول، اور ان کے علاقے
کے باشندوں سے واقف ہونے کا موقع ملے گا۔ پروفیسر صاحب نے عرصے سے محسوس کی ہوئی کمی
کو پورا کیا ہے۔ اس لئے ہم انھیں مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

اُمید ہے کہ یہ کتاب ان اربابِ علم کی مقبولیت حاصل کرے گی جن کے لئے یہ لکھی گئی ہے

محمد عبداللہ

سخنہائے گفتنی

ظاہر ہے کہ اقبالؔ اور نذرالاسلام دونوں پاک و ہند کے چوٹی کے شاعر ہیں۔ دونوں ہمارے قومی شاعر ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں میں بیداری کی روح پھونکی پاک و ہند کے حصولِ آزادی کی راہ میں اہم کردار ادا کیا۔

اقبالؔ اُردو اور فارسی کے شاعر ہیں۔ ان کا کلام بنگلہ میں نہ ہونے کی بنا پر بنگال پر ان کے پیغامات کا خاطر خواہ اثر نہ ہو سکا۔ نذرُالاسلام ہی نے اِس سرزمین میں ان کے مقاصد کو بار آور بنایا۔ اور یہاں کے عوام خاص کر مسلمانوں کو آزادی کے جذبے سے سرشار کیا۔ ان کی شاعری بنگال کے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا سبب بنی۔ اس لئے پاکستان کے لوگ بیک وقت اقبالؔ اور نذرُالاسلام دونوں کے مرہونِ منّت ہیں۔ قوم کو ان سے روشناس کرانا ہمارا اخلاقی فرض ہے۔

اُردو اور انگریزی کے علاوہ بنگلہ میں بھی اقبالؔ پر کافی لکھا جا چکا ہے۔ بنگلہ کے ذریعے بھی ان کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے مواد کم و بیش ملتا ہے۔

نذرُالاسلام بنگلہ کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کا تمام تر سرمایہ بنگلہ میں ہے۔ مگر جہاں تک ہمیں معلوم ہے تراجم کی دو چار چھوٹی چھوٹی کتابوں کے سوا اب تک نذرالاسلام پر اُردو میں کوئی ایسی جامع کتاب نہیں لکھی گئی ہے جس سے بنگلہ نہ جاننے والے اُردو داں ان کے حالاتِ زندگی، ان کی ذہنی نشو و نما اور ان کی شاعری کے تمام پہلوؤں سے واقف ہو سکیں۔

میں نے یہ کمی پوری کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب سے قارئین کو کسی قدر بھی فائدہ

پہنچے تو میری سعی مشکور ہوگی۔

میں اپنے اُستاد محترم جناب ڈاکٹر عندلیب شادانی کا خاص طور سے ممنون ہوں کہ انہوں نے انتہائی مصروفیت کے باوجود اس کتاب کے مسودے کی نظر ثانی فرما کر میری ہمت افزائی کی ہے۔ ان کی اصلاح سے اس کتاب کی بہت سی خامیاں دور ہو گئی ہیں۔

اس کتاب کا پورا مسودہ ڈاکٹر قاضی دین محمد کی نظر سے بھی گزر چکا ہے۔ انہوں نے ندی اسلام کی بابت مجھے مفید معلومات عطا کی ہیں۔ میں اس کے لئے ان کا نہایت احسان مند ہوں۔

میں اپنے شفیق اُستاد جناب نفیس احمد چوہدری، جناب حنیف فوقؔ، محب مکرم اختر العالم اور فروغ احمد کا بھی بے حد شکر گزار ہوں جنھوں نے بعض مقامات پر میری رہنمائی کی ہے۔

نذرالاسلام پر ایک طائرانہ نظر

خدا کے عاشق تو ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں، مارے مارے لیکن
میں اس کا بندہ ہوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا۔

(اقبال)

نذرالاسلام کا نام محتاج بیان نہیں۔ ان کا نام پاک وہند کے ہر اہل علم کو بخوبی معلوم ہے۔ مشرقی پاکستان میں تو ان کا نام بچے بچے کی زبان پر ہے۔ وہ ہندو مسلم دونوں کے محبوب ہیں۔ دونوں فرقے یکساں انہیں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ وہ بیک وقت چوٹی کے شاعر بھی ہیں اور صاحب طرز ادیب بھی۔ گیت اور غزلوں کے خالق بھی ہیں اور موسیقی کے ماہر بھی۔ صحافی بھی ہیں اور محب وطن بھی۔ باغی بھی ہیں اور عاشق سرمست بھی۔ مگر سب سے بڑھ کر ایک انسان دوست ہیں۔

نذرالاسلام ذات پات کی تنگ نظریوں اور کم ظرفیوں سے بالاتر تھے۔ ان کے دل میں آدمیت کا بڑا احترام تھا۔ وہ زندگی بھر انسانیت کے علمبردار رہے۔ اور اسی کے لئے اپنی تمام وقف کردی۔ وہ ہندو اور مسلمان دونوں کے ہی خواہ اور دونوں کے تہذیب و تمدن کے ترجمان تھے۔ انہوں نے "اسلامی سنگیت" بھی گائے اور "شیام سنگیت" بھی۔ ان کے پہلو میں ایک حساس اور دردمند دل تھا۔ وہ دکھ درد کی گود میں پل کر جوان ہوئے۔ اس لئے لوگوں کے دکھ درد کو دل سے محسوس کر سکے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد ملک ایک نازک حالت میں سے گذر رہا تھا۔ ملک کے عوام بدیسی حکومت اور ملوکیت کی غلامی اور جبرو دستبرد کے باعث کراہ رہے تھے۔ سرمایہ دار طبقہ

غریبوں، مزدوروں اور کسانوں کا خون چوس رہا تھا۔ ہندو اور مسلمان فرقہ وارانہ فسادات میں اُلجھ کر اپنے ملک کے اقتدار کی بیخ کنی کر رہے تھے۔ ان ناساعد حالات میں نذرالاسلام "دھوم کیتو" (دُمدار ستارہ) بن کر ان میں غیر متوقع طور پر نمودار ہوئے

شاعر نذرالاسلام کو خاکِ وطن سے والہانہ محبت اور مظلوم انسانیت سے گہری ہمدردی تھی۔ ان کو ملک اور عوام کی ابتری و زبوں حالی ایک آنکھ نہ بھائی۔ انہوں نے عام شاعروں کی طرح زندگی کی بیاہی اور سرگرمیوں سے منہ موڑ کر گل و بلبل کی شاعری نہیں کی۔ وہ "ادب برائے ادب" کے قائل نہ تھے بلکہ "ادب برائے زندگی" کے حامی تھے۔ ان کے یہاں سچی کردار ہے۔ انہوں نے شاعری سے دماغی عیاشی نہیں کی۔ ساحل سے طوفان کا تماشہ دیکھنا گوارا نہیں کیا۔ انہوں نے اس دور میں جبکہ "رُخِ سحری کی لکس" کچھ نمایاں تھی، اپنی "آگنی بینا" (آتشیں بین باجہ) اُٹھائی اور اس سے ملک بھر میں آگ لگا دی۔ ایک ایسا صور پھونکا جس سے ہر دل میں حصولِ آزادی کی ایک نئی روح، ایک نئی تڑپ اور ایک نئی ہلچل پیدا ہو گئی انہوں نے "بشیر بانسی" (زہریلی بانسری) بجا کر ظلم کی طاقتوں کو مبہوت کر دیا۔ باغی بن کر غلامی اور ناانصافی کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ آتش بیانی اور شعلہ نوائی سے جبر دستوں اور جفاکاروں کے دل میں تھرتھراہٹ اور زمین و آسمان میں زلزلہ پیدا کر دیا۔ آتش فشاں اخبار "دھوم کیتو" شائع کر کے (۱۲ اگست ۱۹۲۲ء) اپنی للکار اور غیظ و غضب سے حکومت میں کپکپی پیدا کر دی۔ وہ سامراج کے بدترین دشمن تھے۔ آخر "دھوم کیتو" کی اشاعت سے وہ خود بھی حکومت کے بدترین دشمن بن گئے۔ نتیجے میں قید بامشقت کی سزا جھیلی۔ پھر بھی باطل کے آگے سر نہیں جھکایا۔ "لانگل" (کلکتہ، ۱۶ دسمبر ۱۹۲۵ء) میں نظمیں اور گانے شائع کر کے انسانی مساوات کی تعلیم دی۔ مزدوروں اور کسانوں کو صورِ اسرافیل پھونک کر جھنجھوڑ دیا اور انہیں خوابِ غفلت سے چونکا کر اپنے حقوق حاصل کرنے کی دعوت دی۔ ایک روشن مستقبل کا مژدہ سنایا جو موج بلا کے تھپیڑے کھا کھا کر مصیبت زدوں کو قعرِ ہلاکت سے نکالنے کی کوشش کی اور دوبھر کر عوام کی رگِ حمیت میں خون دوڑایا ہندو مسلم اتحاد کا راگ الاپا اور ہندو مسلم کے پیارے بھی بنے۔ شباب کے ترانے گائے اور نوجوانوں کو لے کر ایک ایسے جہانِ رنگ و بو کی داغ بیل ڈالنا چاہی، جہاں انسان،

انسان کا دشمن نہ ہو، بڑے اور چھوٹے میں فرق اور دولت کی غیر مساوی تقسیم نہ ہو، جہاں مساوات کے گیت گائے جائیں، جہاں ہر فردِ بشر کو یکساں حقوق حاصل ہوں۔ انہوں نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔

نذرالاسلام کی سعی مشکور ہوئی۔ ان کی رجائی شاعری نے لوگوں میں خود اعتمادی کا جذبہ اور آزادی کا ولولہ پیدا کیا۔ انہیں جبر و استبداد کے خلاف سینہ سپر ہوکر میدانِ جنگ میں لاکھڑا کیا۔ "خلافت" اور "ترکِ موالات" کی تحریکیں (۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۲ء) گو وقتی طور پر ناکام ہوئیں، تاہم ان کی روحیں فنا نہیں ہوئیں۔ وہ آئے دن مختلف شکلوں میں رونما ہوتی رہیں۔ شاعر نذرالاسلام نے تحریک "خلافت" اور "ترکِ موالات" کے وقت اپنی شاعری میں جس انقلاب کا بیج بویا تھا، آخر اس کا ثمرہ مرتب ہوکر رہا۔ ملک آزاد ہوا۔ پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔

نذرالاسلام کی ہنگامی نظموں اور گیتوں کی ادبی قدر و منزلت کیا ہوگی، اس کے متعلق یقین کے ساتھ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ اس کا فیصلہ زمانے کی عدالت میں ہوگا۔ ہاں جب تک قوم اور ملک ہر طرح کے ظلم و ستم سے پاک نہ ہو، ان کی انقلابی شاعری کی ضرورت یقیناً باقی رہے گی۔ زمانے کو نذرالاسلام ہمیشہ یاد آئیں گے۔ قوم ہمیشہ ان کی ممنون رہے گی۔

نذرالاسلام کی شاعری بنگلہ زبان و ادب میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس وقت سرزمین بنگال میں رابندر ناتھ ٹیگور کی شاعری کا دور دورہ تھا، چاروں طرف ان کا طوطی بول رہا تھا، بجز چند گنی چنی ہستیوں کے تمام شعراء ان کی کورانہ تقلید کر رہے تھے اور ان کے طرزِ شاعری کو اپنے لئے باعثِ صد افتخار سمجھ رہے تھے، اسی وقت نذرالاسلام ایک غیر معمولی جودت و ذہانت اور زبردست شخصیت لئے ہوئے زبان و ادب کے اُفق پر طلوع ہوئے۔ گو شروع شروع میں انہوں نے ٹیگور کے طرزِ شاعری سے بھی فائدہ اُٹھایا، مگر تھوڑے ہی عرصے میں ان کی انفرادیت پسند طبیعت نے خیالات و بیانات کی عام ڈگر سے ہٹ کر اپنے لئے ایک الگ راستہ ڈھونڈھ نکالا۔ بنگلہ زبان و ادب کو نئے جذبات و احساسات بجدید طرز

نگارش اور اسلوب بیان سے روشناس کرایا۔ مظلوم، کسان، مزدور، ماہی گیر، چور، ڈاکو غرض ہر طبقۂ انسان کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی۔ "بورژوا ادب" کو اونچے محلوں سے اتار کر عوامی ادب بنایا۔ معاشری، سیاسی اور اقتصادی حالات کا نقشہ کھینچ کر ادب کو حیات سے قریب تر کردیا۔ رابندر ناتھ اور ان کے متبعین کی شیریں، دلکش، سُریلی آواز اور نیاز مندانہ رجحانات لئے ہوئے ادب کو صور اسرافیل اور برق میکائیل سے آشنا کیا۔ اس میں رعد کی گرج، بجلی کی تڑپ، طوفان کی تندی اور تلوار کی جھنکار پیدا کی۔ اس کو جرأت مندانہ لب و لہجہ اور فولاد کی سیرت بخشی۔ نئی نئی راگ راگنیوں سے باغِ ادب کو سجایا بسایا۔ سنسکرت آمیز الفاظ کے پہلو بہ پہلو سیکڑوں عربی، فارسی اور اردو الفاظ کے حسین امتزاج اور برمحل استعمال سے بنگلہ زبان و ادب کو ایک نیا رنگ و آہنگ بخشا۔ بنگلہ ادب کو، جو اب تک اسلامی رنگ و روپ، اسلامی تعلیمات و پیغامات سے قریب قریب بے بہرہ تھا، لفظی و معنوی حیثیت سے اسلامی سانچے میں ڈھالا۔

نذرُالاسلام، رابندر ناتھ کے رعب و ادب سے نہیں دبے۔ انھوں نے رسم و رواج کی بندھنوں سے بالاتر ہو کر اپنی انفرادیت کا ثبوت دیا۔ ان کی بلند شخصیت، انوکھے طرزِ فکر، دلکش اور اچھوتے اسلوب بیان نے ان کے بہت سے ہمعصر شعراء پر گہرا اثر ڈالا۔ وہ شہاب ثاقب کی طرح بنگلہ ادب کے اُفق پر رونما ہوئے۔ ان کی روشنی کچھ اتنی تیز تھی کہ آنکھیں چوندھیا گئیں۔ خود ٹیگور کا آفتابِ شہرت جو اس وقت نصف النہار پہ تھا، گہن میں آگیا۔ آخر ٹیگور کو بھی ان کا لوہا ماننا پڑا۔ جب نذرالاسلام نے اپنا ہنگامہ خیز اخبار "دھوم کیتو" شائع کیا، تو شاعر رابندر ناتھ نے ان کی آتش بیانی اور شعلہ باری سے متاثر ہو کر اس کے پہلے ہی نمبر میں ذیل کے الفاظ میں ان کی پذیرائی کی:۔

"اے" "دھوم کیتو" آ، چلا آ

اندھیرے میں آگ کا پل باندھ دے

ان بُرے دنوں میں قلعے کی چوٹی پر

تو اپنی فتح کا پرچم لہرا دے

نحوست کے تلک کو رات کی پیشانی پر

ثبت ہونے دے۔ کوئی پروا نہیں

خواب غفلت میں پڑے ہوؤں کو

جھنجھوڑ کر جگا دے ــــــــ"

نذرالاسلام صرف "آگنی بینا"، "بشیر بانسی"، "بھانگا رگان" (توڑ پھوڑ کے گانے) "پرلئے شکھا" (تباہی کا شعلہ) ہی کے شاعر نہیں، "مہو کیر جانک" (آنکھ کا پپیہا) "دولن چانپا" (پھول کا ایک خاص درخت) "گل باغیچہ" اور "ذو الفقار" جیسی کتابوں کے بھی خالق ہیں۔ ان کے یہاں شعلوں کے ساتھ ساتھ گلدستے بھی ہیں، شمشیر و سنان کے پہلو بہ پہلو طاؤس و رباب بھی ہے۔ لہر ترنگ کے مقابلے میں جل ترنگ بھی موجود ہے۔ وہ بیک وقت شاعر انقلاب بھی ہیں اور قدرتی مناظر کے بہتر نقاش بھی۔ اسلام کی عظمتوں کے پُرخلوص مبلّغ بھی۔ ایک طرف طبلِ جنگ بجاتے ہیں تو دوسری طرف حسن و عشق کا راگ الاپتے ہیں۔

ممکن ہے کہ ان کی بیشتر نظمیں، جو ہنگامی تقاضوں کی بنا پر وجود میں آئیں، "ادب برائے ادب" کے قائل حضرات اور سرمایہ دارانہ ذہنیت رکھنے والوں کو خوش نہ کر سکیں، مگر یہ فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ ان کی غنائی شاعری کا ایک معتدبہ حصہ ایسا ضرور ہے، جو حسنِ فطرت اور قلبی واردات کی صحیح نمائندگی کرتا ہے۔ یہ وہ ادبی سرمایہ ہے جو جمالیاتی قدر کا ذوق رکھنے والوں کو بھی تسکین بخشتا ہے۔ ان کی یہ شاعری ایسی سدا بہار ہے جس پر کبھی خزاں نہیں آئے گی۔ انہوں نے اسلامی نظموں، گیتوں اور غزلوں کا ایسا کافی ذخیرہ چھوڑا ہے، جس کا چرچا ہمیشہ مذہبی اور کیف و سرور کی محفلوں میں یکساں ہوتا رہے گا۔ یہ ادب ہمیشہ مسلمانوں کا خون گرماتا رہے گا اور ان کا دل تڑپاتا رہے گا۔

صد افسوس! تقدیر کے ظالم ہاتھوں نے ہمیں اپنے محبوب شاعر سے قبل از وقت محروم

کر رکھا ہے۔ وہ ہم سے دور (کلکتہ میں) پڑے ہوتے ہیں اور انتہائی نازک حالت میں زندگی کی آخری گھڑیاں گذار رہے ہیں۔ مگر جتنے ہی وہ ہم سے دور ہیں اس سے کہیں زیادہ قریب ہیں کیونکہ ان کی شاعری ہماری زندگی کے ہر مرحلے میں مشعلِ راہ کا کام دیتی ہے۔ وہ قومی اور عہد آفریں شاعر ہیں۔ بنگلہ ادب کے چوٹی کے شاعر ہیں۔ قوم کے دل میں ہمیشہ ان کے لئے ایک معزز جگہ محفوظ رہے گی۔ ان کو خدا کے بندوں سے پیار تھا۔ اس لئے وہ بھی بندوں کے پیارے بنے ہوئے ہیں۔ ان کے کارناموں نے انھیں حیاتِ جاوید بخشی ہے۔ اُمرا کے ایوانوں سے لے کر غریبوں کے جھونپڑوں تک میں ان کی نظموں اور غزلوں کا چرچا ہوتا ہے اور ان کی یاد تازہ رہتی ہے۔
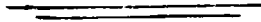
نذرُ الاسلام کے حالاتِ زندگی

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا (اقبال)

قاضی نذرالاسلام ۲۴ مئی ۱۸۹۹ء مطابق ۱۱ جیٹھ ۱۳۰۶ کو قصبہ چُرُلیا (بردوان، مغربی بنگال) کے ایک غریب مگر معزز قاضی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام قاضی فقیر احمد اور والدہ کا نام زاہدہ خاتون تھا۔ ان کے اسلاف شاہ عالم کے عہد میں حاجی پور (پٹنہ) سے چُرُلیا میں آکر بس گئے تھے۔ قاضی فقیر احمد صوفی منش، فراخ دل، صحت مند اور خوب رو انسان تھے۔ انہوں نے اپنے مکان کے قریب مشہور بزرگ حاجی پہلوان مرحوم کے مزار شریف کی خدمت گذاری اور اس سے متصل مسجد کی امامت میں اپنی ساری زندگی گذار دی۔

اسلامی رسوم و احکامات کے سخت پابند ہونے کے باوجود قاضی فقیر احمد ہر مذہب کا دل سے احترام کرتے تھے۔ مختلف مذاہب کے لوگ ان کے ہاں آیا جایا کرتے تھے۔ اپنے والد کی طرح عہدِ شباب میں نذرُ الاسلام بھی قد آور، وجیہہ اور متناسب الاعضا تھے۔ ان کی شاعری میں جو صوفیانہ رجحانات اور ہندو مسلم اتحاد کے جذبات پائے جاتے ہیں، وہ بڑی حد تک انہیں اپنے والد سے ورثے میں ملے۔ قاضی فقیر احمد کے گھرانے میں سات

بیٹے اور دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ بڑے بیٹے قاضی صاحب جان کی پیدائش کے بعد چار بیٹے یکے بعد دیگرے ناگہانی طور پر قضا کر گئے۔ اس کے بعد جب نذر الاسلام پیدا ہوئے تو ان کا عرفی نام "دکھو میاں" رکھا گیا۔ وہ اپنے ہمسایوں اور رشتہ داروں میں اسی نام سے مشہور تھے۔ ان کا بچپن بڑی پریشانی میں گذرا۔ اور آخری زندگی میں بھی انھیں بُرے دنوں کا منھ دیکھنا پڑا۔ کون جانتا تھا کہ ان کا اسم بامسمّٰی ثابت ہوگا۔

نذر الاسلام آٹھ سال کی عمر (۱۳۱۴ ب) میں اپنے والد کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے اس وجہ سے ان کے غریب خاندان کو بڑی دقّت کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کی نوشت و خواند کی راہ میں رکاوٹ پیدا ہوئی۔ ان کی تعلیم کا کوئی اچھا انتظام نہ ہو سکا۔ بچپن میں انھیں دیہات کے آوارہ لڑکوں کے ساتھ زندگی بسر کرنی پڑی۔ وہ اپنے ہمجولیوں کے ساتھ ہنسی مذاق میں آزادانہ زندگی گذارتے تھے۔ ان کی طبیعت میں شوخی اور شرارت بہت تھی۔ ان کی شرارتوں سے پڑوسی تنگ رہتے۔ اس وجہ سے گاؤں والے انھیں "کھیپا" (مستان) کہا کرتے تھے۔ ان کی عملی زندگی میں ہمیں جو آوارہ روی نظر آتی ہے اس کی بنیاد یہیں پڑی تھی۔ ان کی ذکاوت دیکھ کر ان کے گاؤں کے قاضی فضل احمد صاحب انھیں عزیز رکھتے تھے۔ وہ فارسی اور عربی کے بڑے ماہر تھے۔ انھیں کے ہاتھوں نذر الاسلام کی تعلیم فارسی و عربی ابتدا ہوئی۔

دس سال کی عمر (۱۳۱۶ ب) میں انھوں نے ایک مقامی مکتب سے پرائمری امتحان پاس کیا۔ مگر تنگدستی ان کی تعلیم کی راہ میں حارج ہوئی۔ خانگی ذمہ داریوں کے دباؤ سے مجبور ہو کر ان کو روزی کی تلاش کرنی پڑی۔ لطف یہ ہے کہ جس تنگدستی نے ان کی تعلیم و ترقی کے راستے میں روڑے اٹکائے تھے، وہی ان کے حق میں باعث رحمت ثابت ہوئی۔ وہ دکھ درد میں پل کر جوان ہوئے۔ اور اسی نے انھیں غریبوں اور مظلوموں کے دکھ درد کو قریب سے دیکھنے اور اسے دل سے محسوس کرنے کا موقع دیا۔ اور اس احساس ہی نے انھیں عوامی شاعر بنا دیا۔ خود نذر الاسلام کو بھی اس کا احساس تھا۔ وہ اپنی نظم "دارِدُر" (افلاس) میں افلاس سے خطاب کرتے ہوئے اسے زحمت کے بجائے رحمت قرار دیتے ہیں فرماتے ہیں۔

"اے افلاس! تو نے مجھے سرفراز کیا ہے!
تو نے مجھے عیسیٰؑ کے تاجِ خار کی عزت بخشی ہے!
اے زاہد (افلاس)! تو نے مجھے بیباکانہ اظہار کی
ہمت عالی، تند اور عریاں نگاہ اور استرہ کی سی
زبانِ قاطع عطا کی ـــــــــ
تیری رحمتوں کی بدولت میرا بین باجہ تلوار بن گیا ہے۔" (سندھو ہندول)

جس مکتب سے انہوں نے پرائمری امتحان پاس کیا، وہیں معلمی شروع کی اور تقریباً ایک سال تک اسی ملازمت پر قائم رہے۔ اسی زمانے میں انھوں نے آس پاس کے دیہات میں مذہبی فرائض انجام دے کر کچھ روزگار کرنے کی کوشش کی۔ کبھی کبھار حاجی صاحب مرحوم کے مزار شریف اور مسجد کی خدمت انجام دیتے تھے۔ گاہ گاہ اپنے علاقے کے صوفیوں، درویشوں، سادھوؤں اور سنیاسیوں سے رجوع کر کے ان سے روحانی سبق حاصل کرتے۔ اور ان کے طریق کار کو اپنانے کی کوشش بھی کرتے۔ ایک مسلمان پیر کے خادم ہونے کے باوجود، وہ رامائن، مہابھارت اور پُرانوں کا گہرے دل سے مطالعہ کرتے۔ ان کی شاعری میں مختلف رسوم و روایات اور اسلامی وغیرہ اسلامی جذبات و تصورات کی جو آئینہ داری ملتی ہے۔ اس کا ماخذ اور پس منظر غالباً یہی ہے بچپن میں جو باتیں انسان کی گھٹی میں پڑتی ہیں، وہ آخر دم تک قائم رہتی ہیں نذرُالاسلام کی شاعری میں جو عقیدت مندانہ نظمیں اور عارفانہ غزلیں ملتی ہیں، انھیں اسی ذہنیت کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے۔

شاعری کی ابتدا

قاضی نذرالاسلام فطری شاعر تھے۔ ابتدائی عمر ہی میں انھوں نے طبع آزمائی شروع کی۔ ان کے چچا قاضی بذل کریم اہلِ علم تھے۔ وہ شعر و شاعری بھی کرتے تھے۔ ان کے زیرِ ہدایت نذرالاسلام نے "اسلامی بنگلہ" میں نظمیں لکھنی شروع کیں۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں ابتدا ہی سے عربی، فارسی اور اردو الفاظ کا وسیع استعمال شروع کیا۔ ان کے ابتدائی دور کی شاعری میں "پوتھی ادب" کا گہرا رنگ جھلکتا ہے۔

گو خانگی ذمہ داری اور تنگ دستی نے نذرالاسلام کو باقاعدہ تعلیم سے روک رکھا تھا، تاہم اس سے ان کی شاعرانہ اُپج پر کوئی آنچ نہیں آئی۔ چرلیا میں اس وقت بہت سے دیہاتی شعراء تھے۔ ان کی صحبت میں رہ کر نذرالاسلام کا فطری جوہر نمایاں ہونے لگا۔ اس زمانے میں ان کے علاقے میں "لیٹو ناچ" رائج تھا۔ دیہات کے شعراء منظوم ناٹک لکھتے تھے اور انھیں رقص و سرود کے ساتھ 'اسٹیج' کیا جاتا تھا۔ اسی کا نام "لیٹو ناچ" تھا۔ قاضی بذل کریم اور قاضی فضل احمد لیٹو ناچ میں اُستاد کی حیثیت رکھتے تھے۔ نذرالاسلام کو شعر و شاعری کی طرف رجحان تھا۔ کچھ اس لئے اور کچھ روزی کمانے کی غرض سے وہ بھی گیارہ سال کی عمر میں لیٹو ناچ میں شریک ہو گئے۔ اور اس کے لئے رَہَس، گیت، ناٹک وغیرہ لکھتے رہے۔ تھوڑے ہی عرصے میں انھوں نے اس فن میں شہرت حاصل کرلی۔ اپنی طباعی اور فطری شاعر ہونے کا ثبوت پیش کیا۔ ان کی یہ اُپج دیکھ کر لیٹو ناچ کے سرپرست اور کارکنان ان سے گیت اور ناٹک لکھنے کی فرمائش کرنے لگے۔ بعد کی زندگی میں انھوں نے فرمائشی گانوں کی تخلیق میں جس

مہارت کا ثبوت دیا، اس کا پیش خیمہ ہی تھا۔ لیٹونا پٹنہ کے کارکنوں نے انھیں "استاد جی"
کے لقب سے نوازا۔ نیم شاہ گاؤں والوں نے اپنی پارٹی کی استادی کا سہرا ان کے سر باندھا۔
اسے یہ ان کی آمدنی کا اچھا خاصا ذریعہ بن گیا۔

اس سلسلے میں شاعر موصوف کو ہندو مسلم تہذیب و تمدن اور مذہبی روایات
و ثقافت کا کافی مطالعہ کرنا پڑا۔ ثقافتی محفلوں میں سماج کے تہذیب و تمدن کی عکاسی ہوتی
تھی۔ ان کی شاعری پر اس کا گہرا اثر پڑا۔ ان کی ابتدائی شاعری میں مذہبی خیالات اور اسلامی
و غیر اسلامی تہذیب و تمدن کی جو جھلکیاں ملتی ہیں، وہ ان کے عہد شباب کی شاعری میں اور
زیادہ متوح نظر آتی ہیں۔ ذیل میں ان کی ابتدائی شاعری کے دو ایک نمونے پیش کئے جاتے
ہیں۔ اگرچہ ادبی حیثیت سے یہ کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تاہم اس سے اس بات کا اندازہ
ضرور ہوگا کہ ان کی بعد کی شاعری میں جو اسلامی سنگیت، شیام سکیت اور عاشقانہ جذبات
ملتے ہیں، ان کا نقطۂ آغاز یہیں ہے۔ تنوع مضامین، جودت و ذہانت کی پہچان ہے۔ یہ پہچان
ان کی ابتدائی شاعری ہی میں نظر آتی ہے:۔

بدن کی زمین میں ہل چلا۔
اس سے مختلف فصلیں پیدا ہوں گی۔
نماز سے زمین ہموار کی جائے، روزے سے زمین تیار کر لی جائے۔
اور "کلمہ" سے زمین میں چوکی دی جائے۔
تو اس دنیا میں کیا غم!

لا الٰہ الا اللہ
کے اصول کے مطابق بیج بودے۔
اس سے تو ایمان کی فصل کاٹے گا۔
اور آرام سے رہے گا۔ (چاردتا سنگ)

نذرالاسلام کہتا ہے ـــــ بھائی بندگی کر۔
زندگی بھر گناہ سے اپنی حیات کو برباد نہ کر۔
ورنہ حشر میں شرمندگی ہوگی۔

اے ناتھ (محبوب) ! اتنے دنوں کے بعد میں نے تجھ جیسے عیار جوان کا مکر سمجھا ہے
مجھے بتا ! تو نے عشق کا یہ انداز کہاں سے سیکھا ہے۔
تیرا دل بہت ہی سخت ہے۔
اے شیام ! تو عشق کا دستور نہیں جانتا۔
اسی لئے تو نے عشق کی شمع کھا دی ہے
اُسے پھر نہ جلا۔

تیرے ابرو کی کمان نے میرے دل کو بے تاب کر دیا ہے۔
میری جانِ پریشان عشق میں جل رہی ہے۔
اے دھنی (محبوب) ! تجھے دیکھ کر
چاند پر کلنک کا ٹیکہ لگ گیا ہے۔
تیرا بدن کیا ہی حسین ہے ! ــــــــــ
میری متوالی جان تجھ پر قربان ہے۔
اسی لئے بلبل شہد پینے آئی ہے۔

تین چار سال تک لیٹو ناچ میں کام کرنے کے بعد نذرالاسلام کو پھر لکھنے پڑھنے کا شوق ہوا۔ بچپن ہی سے وہ بے چین طبیعت کے مالک تھے۔ پہلے رانی گنج کے "سیارسول راج اسکول" میں پڑھنا شروع کیا۔ مگر کچھ ہی دنوں کے بعد وہاں سے نکل کر "ممر دن ہائی اسکول" کی پانچویں کلاس میں داخل ہو گئے (۱۳۱۸ب) اسکول کی پابندیاں ان پر بار گراں تھیں۔ وہ اکثر اسکول سے فرار

ہو جاتے اور لیٹو ناچ میں جا کر پناہ لیتے۔ اس کے لئے گیت، ناٹک وغیرہ لکھتے یا اِدھر اُدھر آوارہ لڑکوں کے ساتھ مارے مارے پھرتے۔ چھٹی کلاس تک پڑھنے کے بعد مفلسی نے انھیں اسکول چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

ایک دن کسی کو مطلع کئے بغیر وہ رانی گنج چلے گئے اور وہاں ریلوے کے ایک گارڈ صاحب کے شکنجے میں پھنس کر کچھ دنوں باورچی کا کام کیا۔ ان کی آزاد طبیعت کو کسی کام میں لگے رہنا گوارا نہ ہوتا۔ چنانچہ وہ رانی گنج سے اچانک بھاگ کر آسنسول پہنچے۔ اور عبدالواحد نانبائی کی دوکان میں پانچ روپے ماہوار پر ملازمت اختیار کرلی۔ وہاں آٹا گوندھ کر روٹی پکاتے اور فرصت کے اوقات میں گیت اور نظمیں لکھتے۔ سُریلی آواز میں پوتھی پڑھا کرتے۔ اُس وقت دُنیا کو کیا معلوم تھا کہ آگے چل کر پاک ہند کے گوشے گوشے میں اس معمولی ملازم کا ڈنکا بجتا رہے گا۔ قومی اور عہد آفریں شاعر ہونے کا سہرا ان کے سر باندھا جائے گا۔ اس پوتھی خوانی کا اثر ان کی شاعری پر بھی پڑا۔ ان کے ابتدائی کلام میں پوتھی ادب کا جو رنگ جھلکتا ہے اس پوتھی خوانی کا اثر ضرور پڑا ہے۔

لیٹو ناچ میں اُستاد کی حیثیت سے کام کر کے نذرالاسلام نے موسیقی میں مشاقی حاصل کرلی تھی۔ وہ نانبائی کی دوکان میں اپنے سوز و ساز سے گاہکوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتے تھے۔ اسی زمانے میں انھیں قاضی رفیض الدین صاحب سے جو ان دنوں آسنسول تھانہ کے پولیس انسپکٹر تھے، روشناس ہونے کا موقع ملا۔ ان کی شاعری اور موسیقی کی صلاحیتیں دیکھ کر داروغہ صاحب سمجھ گئے کہ ان میں فطری جودت و ذہانت کا سرمایہ ودیعت کیا گیا ہے۔ انھیں موزوں تعلیم کا موقع ملے، تو یہ ذرّہ ایک روز آفتاب بن کر چمکے گا۔ چنانچہ داروغہ صاحب انھیں وہاں سے ضلع میمن سنگھ، تھانہ تریسال کے قاضیر شملہ نامی گاؤں میں لے آئے اور "دری رام پور ہائی اسکول" کے ساتویں کلاس میں داخل کر دیا (سنہ ۱۳۱۹ ب مطابق سنہ ۱۹۱۴ء)

نذرالاسلام بچپن ہی سے حسن کے پجاری تھے۔ ہر حسن ان کا دل موہ لیتا تھا۔ قاضیر شملہ سے دریرام پور تک پانچ میل کا فاصلہ ہے۔ وہ ہر روز یہ راستہ پیدل طے کرتے اور آمد و رفت

کے وقت دیہات کے سنہرے اور دلکش فطری مناظر سے لطف اُٹھاتے۔ وہ کلاس میں اُداس بیٹھے رہتے اور گاہ گاہ بانسری بجاکر دل بہلاتے۔ وہ اکثر اسکول ناغہ کرتے اور دیہاتی گوالوں کے ساتھ ندی میں مچھلیاں پکڑا کرتے یا اِدھر اُدھر شریر لڑکوں سے مل کر لوگوں کی فصلیں تہس نہس کرتے۔ وہ علم کے پیاسے تو تھے مگر اسکول کی پابندیاں ان پر شاق گذرتی تھیں۔ وہ اسکول کی درسی کتابوں سے زیادہ غیر درسی کتابوں کا مطالعہ کرتے۔ کوئی دلچسپ کتاب مل جاتی تو ختم کئے بغیر نہ چھوڑتے۔ ان کی ذہانت کا یہ عالم تھا کہ اس بے توجہی کے باوجود انہوں نے سالانہ امتحان میں بنگالہ مضمون کا پرچہ نظم میں لکھا۔ ممتحن کو ان کی شاعرانہ صلاحیت اور استعداد دیکھ کر بہت تعجب ہوا۔ بنگلہ کے اُستاد نے تو ان کی تعریف کی مگر دوسرے مضامین میں انہوں نے اپنا نام ڈبو دیا۔ آخرکار امتحان میں ناکام رہے۔ اسی طرح اسکول میں ان کا ایک سال گذر گیا۔

ایک دن اچانک کسی اطلاع کے بغیر نذر الاسلام میمن سنگھ چھوڑ کر اپنے گھر واپس چلے گئے (۱۹۱۴ء) اور دوبارہ لیٹو ناچ میں شریک ہوگئے۔ ان کی طبیعت بے چین تھی کسی کام میں بھی زیادہ عرصے تک لگے رہنا ان کی فطرت میں نہ تھا۔ کچھ عرصے تک لیٹو میں رہ کر ان کا دل اُچاٹ ہوگیا، تو انھیں پھر لکھنے پڑھنے کا خیال ہوا اور "راج ہائی اسکول" (رانی گنج) کی آٹھویں کلاس میں داخل ہوگئے (۱۹۱۵ء) اسی اسکول میں حافظ نور النبی فارسی کے ایک ماہر اُستاد تھے۔ ان کی حوصلہ افزائی پر نذرالاسلام نے فارسی اختیاری مضمون کی حیثیت سے لی۔ اور خوب ذوق و شوق سے پڑھنا شروع کیا۔ اس مرتبہ اسکول میں داخلہ لینے کے بعد ان کی طبیعت میں متانت و سنجیدگی آنے لگی۔ ان کی تعلیم اور شعر و شاعری دونوں پہلو بہ پہلو آگے چلنے لگیں۔ وہ لکھنے پڑھنے میں بے پرواہ تھے۔ مگر ایک ذکی طالب علم تھے۔ ان کی ذکاوت دیکھ کر سیارسول کے راجہ نے انھیں اسکول کی فیس اور ہوسٹل کے خرچ سے سبکدوش کر دیا۔ مزید براں سات روپے ماہوار وظیفہ ان کے لئے مقرر کر دیا۔ ان سہولتوں کو غنیمت سمجھ کر وہ باقاعدگی کے ساتھ لکھنے پڑھنے کی طرف متوجہ ہوگئے۔

نئی زندگی
کا
آغاز

فوج میں نذرالاسلام کی شرکت

سنہ ۱۹۱۷ء .... سنہ ۱۹۱۹ء

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملّا کی اذان اور، مجاہد کی اذان اور (اقبال)

پہلی جنگِ عظیم کے تیسرے سال (سنہ ۱۹۱۷ء) نذرالاسلام دسویں کلاس کے طالب علم تھے۔ ملک میں زور سے فوج میں داخل ہونے کا پروپیگنڈا ہو رہا تھا۔ استہارات کے ذریعے ملک کے گوشے گوشے میں بھرتی ہونے کی ترغیب دی جا رہی تھی۔ نذرالاسلام جیسے جوشیلے اور جواں مرد انسان اس طوفان خیز ہنگامے میں کیسے نچلے بیٹھ سکتے تھے۔ امتحانِ انتخابی ختم ہوتے ہی انھوں نے نمبر ۴۹ بنگالی پلٹن میں اپنا نام درج کرا یا۔ فوجی تربیت کے لئے انھیں مسلسل تین ماہ پشاور کے قریب نوشہرہ میں قیام کرنا پڑا۔ پھر وہاں سے کراچی چلے گئے تھوڑے ہی عرصے میں اس نوجواں سپاہی نے فوج میں اپنی صلاحیت کا ثبوت دیا۔ اس سے خوش ہو کر پلٹن کے اعلیٰ حکام نے "حولدار" کے عہدے پر فائز کیا۔ اور کوارٹر ماسٹر حولدار کی حیثیت سے شعبۂ رسد کی نگرانی انکے سپرد ہوئی۔ فوجیوں میں وہ ہر دل عزیز تھے۔ اس لئے کہ وہ ہمیشہ تارہ بہ تازہ گانوں سے ان کا دل خوش رکھتے تھے۔

نذرُالاسلام کی فوجی زندگی (سنہ ۱۹۱۷ء — سنہ ۱۹۱۹ء) کراچی کی فوجی چھاؤنی میں گذری۔ فوجی ملازمت کے باوجود وہ کبھی ادبی سرگرمیوں سے بے تعلق نہیں رہے سچے معنوں میں ان کی ادبی زندگی یہیں سے شروع ہوئی۔ انھیں جنگ کا منھ دیکھنا پڑا۔ بجز رسمی پابندیوں کے وہاں ان کا کوئی خاص کام نہ تھا۔ فرصت کے اوقات کو غنیمت سمجھ کر فوجی خیمے میں بھی انھوں نے شعر و شاعری اور علمی مشغلہ

جاری رکھا۔ نظمیں، گیت اور افسانے ان کے قلم سے برابر نکلتے ہی رہتے، جو کلکتے کے ادبی رسالوں میں "حوالدار قاضی نذرالاسلام" کے نام سے شائع ہوتے رہے۔

سوغات (جیٹھ ۱۳۲۶ بنگلہ سن ۱۹۱۹ء) میں ان کا افسانہ "باؤنڈولیر آتمو کاہینی" (آوارہ کی آپ بیتی) شائع ہوا۔ یہ ان کا پہلا شائع شدہ مضمون ہے۔ اس افسانے پر ان کی زندگی کی چھاپ نظر آتی ہے۔ اس میں رانی گنج کے سیار سول راج اسکول کا ذکر ہے جہاں انھوں نے تعلیم پائی تھی۔ ادبی حیثیت سے اس کہانی کی قدر و قیمت جو بھی ہو اس سے ہمیں بحث نہیں۔ مگر پہلا مضمون ہونے کی حیثیت سے ان کی ادبی زندگی کی تاریخ میں اس کی اہمیت ضرور ہے۔ یہ افسانہ بعد میں ان کے افسانوں کے مجموعے "ریکتیر بیدن" (بے سروسامانی کی خلش) میں شامل کر لیا گیا۔ اس کتاب کے تمام آٹھ افسانے کراچی کے دوران قیام میں لکھے گئے۔

نذرالاسلام کی نظم "مکتی" (نجات) "بنگیا مسلم ساہتیہ پتر کا" ساون ۱۳۲۶ بنگلہ سن (۱۹۱۹ء) میں شائع۔ یہ ان کی پہلی مطبوعہ نظم ہے۔ یہ رانی گنج کے ایک خاموش فقیر (انتقال ۱۹۱۶ء) کی کہانی پر مشتمل ہے۔ اس درویش کا مقبرہ اب "ہاتھ باندھا فقیر کا مزار" کے نام سے مشہور ہے۔ اس نظم میں روحانیت کے متعلق شاعر کا جو عقیدہ ملتا ہے، ان کی شاعرانہ زندگی کے مختلف مدارج میں اس کا بارہا اظہار ہوا ہے۔

اسی سال (۱۹۱۹ء) اسی رسالے کے کاتک نمبر میں ان کا افسانہ "ہنا" اور ماگھ نمبر میں "ہتبھاردان" (درد کا احسان) منظر عام پر آیا۔ جب یہ دو نو محتقر افسانے شائع ہوئے، تو ذی فہم قارئین سمجھ گئے کہ بنگلہ ادب کے افق پر ایک تابناک ستارہ طلوع ہو رہا ہے۔ بعد میں یہ دو افسانے ان کی کتاب "ہتبھاردان" (۱۹۲۲ء) میں شامل کئے گئے۔

ڈاکٹر شہید اللہ اور فضل حق "بنگیا مسلم ساہتیہ پترکا" کے اڈیٹر تھے۔ کامریڈ مظفر احمد اس کے سرپرستوں میں سے تھے۔ نذرالاسلام کی تحریروں میں جوشِ بیان، ولولۂ حیات اور انقلابی اثرات کو دیکھ کر مظفر احمد صاحب بہت متاثر ہوئے۔ وہ شاعر کے مداح ہو گئے اور گاہ بہ گاہ

مخلصانہ خطوط سے ان کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ اس خط و کتابت سے رفتہ رفتہ دونو کے درمیان محبّت کا رشتہ گہرے سے گہرا ہوتا گیا۔ مظفر احمد صاحب ایک بڑے صاحب قلم اور ممتاز سیاسی رہنما ہیں۔ نذرالاسلام کو عرصۂ دراز تک ان کی صحبت اُٹھانے کا موقع ملا۔ ان پر مظفر احمد صاحب کی ادبی اور سیاسی سرگرمیوں کا گہرا اثر پڑا۔ اگرچہ وہ کامریڈ مظفر احمد کی طرح اشتراکی نہ تھے پھر بھی ان پر اشتراکی تحریک اور روسی انقلاب (نومبر ۱۹۱۷ء) کا اثر ضرور پڑا۔ انھوں نے مزدور تحریکوں میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

سوغات بھادوں ۱۳۲۶ھ میں نذرالاسلام کا افسانہ "سوامی ہارا" (گم کردہ شوہر) اور کسوار میں طنزیہ نظم "کویتا سمادھی" (شاعری کا مزار) شائع ہو۔ اس نظم سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زیادہ تر تحریریں جو وہ کراچی سے اشاعت کے لئے "کلکتے" بھیجتے تھے، شائع ہو جاتی تھیں۔ اسی رسالے کے کاتک نمبر میں ان کا پہلا مقالہ "ترک مہلا رگھومٹا کھلا" (ترکی خاتون بے نقاب) شائع ہوا۔ یہ مقالہ اس مضمون کے رد میں لکھا گیا جو اس سال "بھارت درشن" میں جو ہو اسی عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اس میں ترک خواتین کے حُسن کے متعلق نازیبا اور ناقابل برداشت خیالات کا اظہار کیا گیا تھا۔

نذرالاسلام نے بنگالی پلٹن میں ایک پنجابی مولوی صاحب سے دیوانِ حافظ، مثنوی مولانا روم اور فارسی کی دوسری مشہور کتابیں پڑھیں۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے ان کی نگاہ میں وسعت پیدا ہوئی۔ اور انھیں ایک ہمہ گیر ادب اور ایک اعلیٰ زندگی کا سراغ ملا جس کا اثر ان کے ادب پر بھی گہرے طور پر پڑا۔ اس کا ثبوت ہمیں ان کی ادبی زندگی کی مختلف منازل میں ملتا ہے۔ "بکتیر بیدن" اور "بیتھا روان" میں انہوں نے حسنِ عقیدت کے ساتھ حافظ شیرازی کا ذکر کیا ہے۔ آخری عمر میں انہوں نے تمام رباعیاتِ حافظ اور عمر خیام کی ۱۹۸ رُباعیات کا منظوم بنگلہ ترجمہ کیا۔ رُباعیات حافظ کے مقدمہ میں انہوں نے پنجابی مولوی صاحب کا ذکر کیا ہے۔ اور آخر میں حافظ شیرازی کے حالات زندگی مختصر طور پر قلم بند کئے۔ ان کی عشقیہ شاعری پر حافظ شیرازی اور عمر خیام کا نمایاں اثر نظر آتا ہے۔

اس مقام پر یہ جان لینا مناسب ہوگا کہ نذرالاسلام نے شروع شروع میں افسانہ نگاری سے قارئین کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کرلیا تھا۔ فوجی تربیت کے زمانے میں افسانہ نگاری ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ان کے اس دور کی افسانہ نگاری میں پختگی کی کمی نظر آتی ہے۔ اگرچہ بعد کی زندگی میں انھوں نے کئی اچھے افسانے بھی لکھے پھر بھی وہ افسانہ نگاری کی صفِ اوّل میں نہ آسکے۔ وہ اوّل اوّل ایک شاعر سے زیادہ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے منظرِ عام پر آئے تھے۔

جنگ سے واپسی، سنہ ۱۹۱۹ء

شہرت بہ حیثیتِ شاعر

سنہ ۱۹۱۹ء میں پہلی جنگِ عظیم کا خاتمہ ہو گیا۔ چیت، سنہ ۱۳۲۶ مطابق مارچ، اپریل ۱۹۱۹ء میں بنگالی پلٹن توڑ دی گئی، تو نذر الاسلام کراچی سے سیدھے کلکتہ چلے آئے۔ اور وہاں دو دن کے قیام کے بعد سات آٹھ روز کے لئے اپنے گاؤں چرلیا گئے۔ گھر والوں سے مل کر پھر کلکتہ پہنچے اور "بنگیا مسلم ساہتیہ سمیتی" کے مکان میں رہنے لگے۔ ان کی ادبی سرگرمیاں پورے معنوں میں اسی وقت سے شروع ہوئیں۔ مزمل حق کے صاحبزادے افضل الحق کے زیرِ ادارت بیساکھ سنہ ۱۳۲۷ (سنہ ۱۹۲۰ء) میں کلکتہ سے "مسلم بھارت" شائع ہوا۔ اس کے پہلے نمبر سے نذر الاسلام کا پہلا ناول "باندھن ہارا" (بے قید) قسط وار شائع ہوتا رہا۔ اس کا زیادہ تر حصہ کراچی کے دورانِ قیام میں لکھا گیا تھا۔ سنہ ۱۹۲۷ء میں یہ ناول کتابی شکل میں شائع ہوا۔ یہ کتاب ایک ناکام محبت کی داستان ہے اور اس جذبۂ ناکامی نے آخر تک پہنچتے پہنچتے بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔ اس ناول کے ایک کردار کا نام ساہسکا ہے۔ اس کے ایک مفصل خط میں نذر الاسلام نے جس بغاوت کی توضیح کی، وہی بعد میں پورے خدوخال کے ساتھ ان کی شہرۂ آفاق نظم "بدروہی" (باغی) میں نمایاں ہوئی۔ "باندھن ہارا" میں ساہسکا نے رادیہ کے نام جو خط لکھا، اس میں اس بات کی وضاحت ہے کہ اگر انسان ترقی کرتے ہوئے خالقِ کائنات سے بغاوت بھی کر گذرے تو یہ موجبِ کفر نہیں موجبِ قربت ہے۔

نذر الاسلام کے ابتدائی دور کی اہم نظمیں بیشتر "مسلم بھارت" میں شائع ہوئیں۔ اس رسالہ نے ان کی شاعری کو مقبولِ عام بنانے میں بڑی مدد دی۔ اس کے جیٹھ نمبر سنہ ۱۳۲۷ (سنہ ۱۹۲۰ء)

میں حافظ کی غزل ـــــ "یوسف گم گشتہ باز آید بکنعان غم مخور" کے مضمون کے مطابق اس کا ایک گیت اور "شط العرب" کے عنوان سے ایک اور نظم شائع ہوئی۔ اساڑھ میں حافظ کی ایک غزل کے خیال اور بحر کے مطابق "بادل پرئیر شراب" (ابر آمد و نسیم کی شراب) ساون میں "کھیا پار تری" (دریا کے پار اترنے کی کشتی) بھادوں میں "قربانی" کنوار میں "محرم" کاتک میں ایک گانا "انجمن میں" "فاتحہ دوازدہم" اور حافظ کی دوسری ایک غزل کا ترجمہ شائع ہوا۔ ماگھ میں حافظ کی اور ایک غزل کا ترجمہ پھاگن میں "مری"، "غمخوار" کے عنوان سے ایک گیت، چیت میں دوسرا ایک گیت غرض مختصر عرصے میں مختلف نظمیں، گانے اور مضامین یکے بعد دیگرے منظر عام پر آگئے۔ نذر الاسلام کی دو اور معرکۃ الآرا نظمیں "بدروہی" اور "کمال پاشا" بھی بعد میں یک وقت اسی رسالے میں شائع کی گئیں جب ان کی نظم "کھیا پار تری" اور "بادل پرئیر شراب" شائع ہوئی، تو ان کے ہم عصر شاعر موہت لال مجمودار نے "مسلم بھارت" بھادوں ۱۳۲۷ میں ان کے نام ایک خط لکھ کر ان کی نظموں کی خوب خوب داد دی۔ اسے نذر الاسلام کا ایک خداداد جوہر ہی کہہ سکتے ہیں کہ جنگ سے واپس آکر ایک ہی سال کی مدت میں انھوں نے نظموں کی ایک لمبی فہرست بنگلہ ادب کے سامنے پیش کر دی اور وہ ملک بھر میں ایک ممتاز شاعر کی حیثیت سے تسلیم کر لیے گئے۔ شاعری کے افق پر طلوع ہوتے ہی نذر الاسلام کو جتنی جلدی مقبولیت حاصل ہوئی، وہ بہت ہی کم شاعروں کو نصیب ہوتی ہے۔

نذرالاسلام "نوجگ" میں سنہ ۱۹۲۰ء

سنہ ۱۹۲۰ء میں تحریک خلافت کے ممتاز رہنما مولوی اے کے فضل الحق مرحوم (سنہ ۱۸۷۳ء۔
سنہ ۱۹۶۲ء) کا روزنامہ "نوجگ" کلکتے سے شائع ہوا۔ کامریڈ مظفر احمد اور نذرالاسلام اس
کے اڈیٹر مقرر ہوئے۔ انہوں نے اپنی شعلہ بیانی سے تحریکِ آزادی کو بڑی تقویت بخشی
اسی اخبار میں سب سے پہلے کھلے الفاظ میں کسانوں اور مزدوروں کی نمائندگی کی گئی۔ ان کی کوششوں
سے اس روزنامے نے بہت جلد ہندو مسلم دونوں طبقوں میں مقبولیت حاصل کرلی۔ سیاسی
معاملات میں اے کے فضل الحق سے نذرالاسلام کا اتفاق رائے نہ ہوسکا۔ اس لئے انہوں
نے کچھ عرصے کے بعد "نوجگ" کا کام چھوڑ دیا۔ ان کے اداریوں میں "ہڑتال" اور "نظرانداز
کی ہوئی طاقت کی بیداری" قابل ذکر ہیں۔ ان کے "نوجگ" میں لکھے ہوئے اداریوں کا انتخاب
بعد میں "جوگ بانی" (نوائے وقت) کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوا (سنہ ۱۹۲۲ء) یہ ان کی
پہلی مطبوعہ کتاب ہے۔ اسے حکومت وقت نے اپنے مفاد کے خلاف سمجھ کر ضبط کرلیا۔

کوملا میں پہلی شادی سنہ ۱۹۲۱ء

ایک روز کسی کو مطلع کئے بغیر نذرالاسلام "نوجگ" کا کام چھوڑ کر دیوگھر چلے گئے اور
کچھ دنوں بعد وہاں سے واپس آکر افضل الحق کے ساتھ "ساہتیہ سمیتی" کے دفتر میں رہنے لگے۔
وہاں مشہور ناشر علی اکبر خاں بھی رہتے تھے۔ ان کا گھر دولت پور (کوملا) میں تھا۔ ایک دن
نذرالاسلام ان کے ہمراہ دولت پور چلے آئے (سنہ ۱۹۲۱ء) اور کچھ دنوں وہاں قیام کیا۔ اس اثنا میں
علی اکبر خاں کی ایک بھانجی سے انکی محبت ہوگئی ۳ اساڑھ ۱۳۲۸ بنگلہ (جون سنہ ۱۹۲۱ء) کو علی اکبر
کی وکالت پر ان کی بھانجی سے نذرالاسلام کی شادی ہوگئی۔ مگر علی اکبر خاں اور انکی بیوی کے
ترش سلوک سے تنگ آکر وہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد کلکتہ چلے آئے اور بیوی سے ہمیشہ کے لئے

علیحدگی اختیار کرلی۔ مگر ان کے دل میں ہمیشہ اس فرقت کا دکھ رہا۔ علیحدگی کے سولہ سال کے بعد یکم جولائی ۱۹۳۷ء کو انھوں نے اس محبوبہ کے نام جو خط لکھا اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"میرے دل کا مالک ہی جانتا ہے کہ تمہارے لئے میرے دل میں کیسا گہرا زخم اور کتنا درد ہے۔ مگر اس درد کی آگ میں تنہا میں ہی جلا۔ اس سے تمہیں جلانا کبھی پسند نہ کیا۔ تم نے مجھے آگ کا یہ پارس نہ دیا ہوتا تو میں آگ کی یہ مینا ہرگز نہ بجا سکتا۔ دھوم کیتو کی حیثیت سے کر طلوع نہ ہو سکتا۔"

ان الفاظ سے یہ اندازہ ضرور ہوگا کہ نذرالاسلام کے دل میں عرصہ دراز تک اس محبوبہ کی معارفت کا رنج جاگزیں رہا۔ اور اس دردِ فراق کا گہرا اثر ان کی شاعری پر ضرور پڑا۔ علیحدگی کے بعد اس محبوبہ (نرگس خانم) نے اپنی ایک کتاب میں نذرالاسلام پر کچھ چوٹیں کیں، جس کے جواب میں "ہنگساتیہ" (کینہ پرور) کے عنوان سے انھیں ایک نظم لکھی پڑی یہ سوغات حیثیتہ ۱۳۳۸ء میں یہ نظم شائع ہوئی۔ اور بعد میں "سنکر پاک" کی فہرست اسے جگہ ملی۔ علاوہ ازیں اس کتاب کے بہت سے گانوں کے سوتے غالباً شاعر کے اسی دردِ فراق کے سرچشمہ سے پھوٹے ہیں۔

نذرالاسلام کی شہرۂ آفاق نظم "بدروہی" کی اشاعت ۱۹۲۱ء

یہ رودستِ ونرمیت کاری کا ہے مقام
میداں جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ (اقبال)

کومِلا سے واپسی کے بعد نذرالاسلام تال تلا لین (کلکتہ) کے ایک مکان میں اقامت گزیں ہو گئے۔ (جولائی ۱۹۲۱ء) اسی مکان میں رہ کر انھوں نے اپنی نظم "بھانگا گان" لکھی۔ اسی وقت انھوں نے اپنی شہرۂ آفاق نظم بدروہی (باغی) قوم کے سامنے پیش کی۔

(۱۹۲۱ء) دو سال بعد جب نوجوان شاعر نے صحیح معنوں میں شاعری کے میدان میں پہلا قدم رکھا تھا اور جس کی عمر صرف بائیس سال کی تھی، اس کے قلم سے "بدروہی" جیسی آتش بار اور ہنگامہ خیز نظم کا نکلنا حیرت انگیز ہے۔ "بدروہی" اولاً ہفتہ وار "بجلی" (۱۹۲۱ء) میں شائع ہوئی اور بیک وقت "پرباسی" ماہانہ "بسومتی" "سادھنا" اور دوسرے رسالوں میں بھی چھپی۔ بعد ازاں "مسلم بھارت" کے کاتک نمبر ۱۳۲۸ میں ان کی یہ نظم نیز "کمال پاشا" کے عنوان سے ایک دوسری نظم شائع ہوئی۔ "ادبودھن"، "اسلامی درشن" اور دوسرے رسالوں میں اس نظم کی موافقت اور مخالفت میں مضامین شائع کئے گئے۔ بعض لوگوں نے انھیں ملحد اور کافر تک کہا۔ مسلم بھارت، اگھن ۱۳۲۸ء میں شاعر شوئی لیندر گنگا نے "بدوہیر" (بہادر باغی) کے عنوان سے ایک طویل نظم لکھ کر نذر الاسلام کو خراج عقیدت پیش کیا۔ دوسری طرف شاعر غلام مصطفےٰ نے ان کے خلاف "نین ترتیو" (منظم) کی سرخی سے "دعا" (ماگھ) میں ایک نظم لکھی۔ غرض نذر الاسلام کی اس نظم نے بنگلہ ادب نیز اہل بنگال کی زندگی میں ایک بڑا انقلاب پیدا کر دیا۔ عوام میں حصولِ آزادی کی ایک نئی روح پھونک دی۔ ملوکیت پر کاری ضرب لگائی۔ جفاکار اور سرمایہ دار طبقے میں بوکھلاہٹ پیدا کر دی۔ چشم زدن میں ملک کے گوشے گوشے میں اس نظم سے ان کی دھاک بیٹھ گئی۔

یوں تو اس سے قبل ہی ان کے قلم سے "انور"، "شط العرب"، "رن بھیری" (طبلِ جنگ) "قربانی"، "محرم" جیسی اہم نظمیں نکل چکی تھیں اور ان جواہر پاروں نے انھیں ایک اعلیٰ درجہ کا شاعر ثابت کر دیا تھا مگر "بدروہی" کی اشاعت نے انھیں ایک عہد آفریں اور باغی شاعر ہونے کا امتیاز بخشا کیونکہ اب تک بنگلہ ادب اس قسم کی باغیانہ اور جرأت مندانہ نظم سے یکسر خالی تھا۔ ممکن ہے کہ فنّی محاسن کے اعتبار سے اس نظم میں بعض خامیاں ہوں، لیکن اس میں شک نہیں کہ رنگ و آہنگ کے اعتبار سے یہ نظم بنگلہ زبان و ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ بغاوت و انقلاب اور تیزی و تندی کی ایسی جیتی جاگتی تصویر شاید ہی کہیں اور ملے۔ خود نذر الاسلام کے قلم سے بھی ایسی نظم اور کبھی نہ نکلی۔ اب تک وہ "سپاہی شاعر"

، نام سے مشہور تھے۔ مگر اس نظم کے شائع ہونے کے بعد لوگوں نے انھیں "باغی شاعر" لقب سے نوازا۔ نمونے کے طور پر اس نظم کا کچھ حصہ ملاحظہ ہو۔

کہہ دے بہادر ——

کہہ دے کہ میں سر بلند ہوں!

اتنا سر بلند کہ ہمالیہ کی چوٹی بھی میری سربلندی کو دیکھ کر سرنگوں ہو جاتی ہے!

کہہ دے بہادر ——

کہہ دے کہ میں کائنات کا وسیع آسمان پھاڑ کر،

چاند، سورج اور تاروں سے گزر کر،

زمین و آسمان کا احاطہ چیر کر،

خدا کا عرش چھید کر،

مدبّر عالم (خدا) کی دائمی حیرت بن کر ابھر آیا ہوں۔

میری پیشانی پر رُدر بھگوان (شیو) چمکتا ہے۔ اس میں اقبال مندی کا راج تلک روشن ہے

● ● ●

کہہ دے بہادر ——

میں ہمیشہ سربلند ہوں۔

میں کبھی دبنے والا نہیں۔ غیر متواضع اور سنگدل ہوں۔

میں ہیبت ناک تباہی کا ناچتا ہوا نٹراج ہوں۔ میں طوفان ہوں، میں تباہی ہوں۔

میں دہشت ہوں۔ میں دنیا کا غضب ہوں۔

میں مخالفت سے باز آنے والا نہیں۔

میں سب توڑ کر چکنا چور کر دیتا ہوں!

میں بے ضابطہ اور بے نظام ہوں۔

میں تمام بندشوں اور آئین قانون کی پابندیوں کو روند ڈالتا ہوں!

• [illegible] کا ایک مشہور دیوتا۔

میں کسی آئین کو نہیں مانتا ۔
میں بھری کشتی کو بالکل ڈبو دیتا ہوں ۔ میں تارپیڈو ہوں، میں تیرتا ہوا خطرناک مائین ہوں ۔
میں بیتو ہوں ۔ میں بکھرے بالوں میں بے موسم کبھی قیامت خیز طوفان برپا کرتا ہوں ۔
میں باغی ہوں میں مد برجہاں کا بھیجا ہوا باغی ہوں ۔

کہہ دے بہادر ______

میں ہمیشہ سربلند ہوں ۔ (بدروہی، اگنی بینا)

"کمال پاشا" بھی نذرالاسلام کی ایک مہتم بالشان نظم ہے جب کمال پاشا نے یونانیوں کو شکست دے کر سمرنا پر قبضہ جمالیا (سنہ ۱۹۲۲ء) تو انھوں نے خوشی کی موج میں یہ نظم لکھی ۔ اس میں انھوں نے کمال پاشا کی فتح و نصرت کا گیت گایا ۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے ملک کی غلامانہ زندگی کی کلفت اور حصولِ آزادی کے ولولے کی تصویر بھی کھینچی ۔ انھوں نے اس نظم میں ہراس جنگ کو جائز قرار دیا جو اپنے ملک کی آزادی کے لئے ہو ۔ اور ہراس جنگ کے خلاف اظہارِ نفرت کیا جس سے دوسرے ملک کی آزادی پر آنچ آئے وہ لٹیرے یونانیوں کے خلاف اپنے غم و غصے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں :۔

بھائی ! یہ سب لوگ کینہ کش جانور ہیں ۔ انہوں نے سپاہیوں کا نام ڈبو دیا ۔
اس لیے کہیں ان کا وجود نہیں مگر ہم تو ذرا بھی نہیں دبے ۔
جو پرائے ملک کو لوٹ کر کھا جاتے ہیں، وہی ڈاکو ہیں، یقیناً ڈاکو ہیں ۔
بھائی ! یہی وجہ ہے کہ ان کی قسمت میں ضرب کاری کے سوا کچھ نہیں ۔
(کمال پاشا، اگنی بینا)

اپنے ملک کی آزادی کے لئے جو لوگ جان قربان کرتے ہیں، شاعر انھیں "شہید" اور "زندہ جاوید" قرار دیتے ہیں ۔ ان کی شہادت پر آنسو بہانا انھیں بالکل پسند نہیں ۔ فرماتے ہیں ۔

انھوں نے موت پر فتح پائی رونا کس لئے ؟
یہ خود زہر کی پیالی پی کر آب زمزم لائے
کون مر گیا ہے ؟ رونا کس لئے ؟
انھوں نے اچھا ہی کیا ہے !
ملک بچانے کے لئے اپنی جان قربان کر دی ۔ انھوں نے اچھا ہی کیا ہے !
یہ لوگ شہید ہیں ۔ ضرور شہید ہیں)
(کمال پاشا، اگنی بینا)

نذر الاسلام پھر کومِلا میں، ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۲ء

۱۹۲۱ء کے آخر میں نذر الاسلام کومِلا کے کاندیر پاڑ گئے اور وہاں ایک عرصے تک قیام کیا ۔ ان کی کتاب "چھایانٹ" اور "پوبیر ہوا" کی بعض نظمیں اور گانے اس زمانے کی یادگار ہیں ۔ کومِلا کے دوران قیام میں انھیں وہاں کے بہت معزز خاندانوں سے متعارف ہونے کا موقع ملا ۔ اسی زمانے میں اُن کی پرجا سُندری سے بھی شناسائی ہوئی ۔ جن کے شوہر کی بھتیجی پرمیلا سے بعد میں ان کی دوسری شادی ہوئی (۱۹۲۴ء) کومِلا کی گومتی ۔ ندی کے دلکش نظارے کا بیان ان کے گیتوں میں ملتا ہے ۔ گومتی کا ایک نظارہ شاعر کی زبان میں ملاحظہ ہو ۔

اُداس دوپہر کب کی بیت گئی ، اب شام بھی گذر رہی ہے ۔
گومتی ندی کے گھونگر و پہنے ہوئے پاؤں سے نیند لپٹ گئی ہے ۔
(چینی ہوا، چھایانٹ)

پہلی جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی ۔ ملک میں حصولِ آزادی کی تحریکیں زور پکڑتی جا رہی تھیں

ترکِ موالات اور خلافت کی تحریکیں شباب پر تھیں۔ نذرالاسلام نے سیاسی جذبات سے متاثر ہو کر عوام کو برملا فتح و نصرت کی خوشخبری سنائی۔ سربراہِ قوم کو قید خانوں کی آہنی دیواریں توڑ پھوڑ کر نیا سماج تعمیر کرنے کی دعوت دی۔ قومی بیداری کے گیت گائے۔ دولت پور، کومِلا، ڈھاکہ غرض مختلف مقامات میں جا جا کر عوام میں سیاسی شعور پیدا کرنے کی کوشش کی۔

۲۱ر نومبر ۱۹۲۱ء کو جب انگلستان کے پرنس آف ویلس پاک و ہند کی سیر کو آئے، تو کانگریس کے زیرِ سرکردگی ملک بھر میں ہڑتال منائی گئی۔ اس وقت کومِلا کی مقامی کانگریس نے نذرالاسلام سے "جاگرنی" (نغمۂ بیداری) کے عنوان سے قومی بیداری کا ایک گانا لکھوایا۔ انھوں نے فرمائشی گانا لکھنے ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ ہڑتال کے دن جلوس میں شریک ہو کر گلے میں ہارمونیم لٹکائے یہ گانا خود راستے میں گاتے پھرے۔ اس نظم میں شاعر نے انسانیت کی بھیک مانگی۔ اہلِ اقتدار کے سامنے مفلوک الحال قوم کی نجات کا مسئلہ پیش کیا۔ اس گانے کی چند سطریں ملاحظہ ہوں:۔

اے شہریو! منہ موڑ کر دیکھو۔
تمہاری بھوکی اولادیں دروازے پر ہیں۔
دو ـــــ انسانیت کی بھیک دو۔
جاگو! جاگو!
خوابِ غفلت میں پڑے ہوئے لوگو! جاگو۔
جاگو رے! جاگو!

(جاگرنی، بھانگار گان)

تحریکِ خلافت اور تحریکِ ترکِ موالات میں جب مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی گرفتار کر لئے گئے (ستمبر ۱۹۲۱ء) تو نذرالاسلام نے حکومت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی:۔

ہمارے سینے میں سچّا خدا جاگتا ہے۔

آج ہم یہ دیکھ لیں گے کہ اللہ کے گلے میں کون زنجیر ڈال سکتا ہے؟

ترکِ موالات اور خلافت کی تحریکوں میں ہندو مسلم اتحاد، ملک کے لئے حریت پسندوں کی قربانی اور جاں نثاری کی تصویر نذرالاسلام نے ان الفاظ میں کھینچی۔

ہم روئیں گے نہیں۔ جاؤ ــــــ قید خانے میں جاؤ۔ جب ہی تو تم بہادروں کی جماعت ہو۔

وہی زنجیر ہمارے تیس کروڑ لوگوں کو آپس میں بھائی بھائی بنا دے گی۔
نجات اور ملاپ کے لئے جنہوں نے جان کی قربانی دی ہے۔
ہم ہندو مسلم انھیں کی جیت کے گیت گائے جاتے ہیں۔
جن کی زنجیروں کی آواز سے بہادروں کی شمشیرِ نجات بے نیام ہو گئی ہے
ہم انہیں کے تیس کروڑ بھائی ہیں اور انھیں کی مدح سرائی کئے جاتے ہیں۔
(بندناگان، بشیر بالسی)

تحریک ترک موالات کے پروگرام میں چرخہ سے سوت کاتنا بھی داخل تھا۔ کپڑے میں ملک کو خود کفیل بنانے کے لئے حریت پسند علما اور گاندھی جی نے لوگوں کو سوت کاتنے کی ترغیب دی۔ ان کا کہنا تھا کہ اسی کے توسط سے ملک کی آزادی حاصل ہو گی۔ نذرالاسلام نے بھی اپنی شاعری میں اس راہِ عمل کی پُر زور حمایت کی:۔

گھوم ــــــ

گھوم رے گھوم، میرے پیارے چرخے گھوم!
تیرے چرخے کی آواز میں آزادی کی آمد آمد کا غلغلہ سن رہا ہوں!
بھائی! تیری گردش کی آواز میں
گویا ہمیشہ یہی سننے میں آتا ہے کہ
"آزادی کا عظیم الشان دروازہ کھل رہا ہے۔ اب دیر نہیں۔
بھارت کا طالع مسعود پلٹ آیا ہے۔ دُکھ کی اندھیری رات بیت چکی ہے۔
(چرکارگان، بشیر بالسی)

جب ترکِ موالات کی تحریک حسب توقع کامیاب نہیں ہو رہی تھی اور سیاسی میدان میں پھوٹ پڑنے لگی تو دیس بندھو چترنجن داس نے کانگریس ہی میں رہ کر موتی لال نہرو کی حمایت سے "سوراجیہ دل" کے نام سے اپنا ایک الگ محاذ قائم کر لیا تھا۔ سبھاش چندر نے بھی ان کا ہاتھ بٹایا۔ مشہور ادیب سرت چندر (۱۸۷۶ء - ۱۹۳۸ء) بھی ان کی اس تحریک میں شریک ہو گئے۔ اس وقت دیس بندھو کو نذرالاسلام جیسے غیور آدمی کی ضرورت پڑی۔ چنانچہ انھوں نے باغی شاعر نذرالاسلام کو بھی اپنا ہمنوا بنا لیا۔ ان کے اخبار "نراین" میں تاگ کی بہت سی نظمیں اور گیت جو انھوں نے اس تحریک کی حمایت میں لکھے شائع ہوئے

جیسا کہ ۱۳۲۹ء میں نذرالاسلام نے اپنی رجائی نظم "پرلئے اُلاس" (تباہی کی خوشی) لکھی اس سلسلے میں انھوں نے بتایا کہ تباہی کے بغیر انقلاب وجود میں نہیں آسکتا۔ لہٰذا شاعر کی بغاوت سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ بغاوت کا مقصد تجدید اور تعمیر ہے۔ یہ نظم بعد میں اگنی بینا میں شامل کر لی گئی۔

کومِلا کے دورانِ قیام میں نذرالاسلام کو پرمیلا عرف دُلی یا دولن سے گہری محبت ہو گئی۔ نذرالاسلام نے اس محبوبہ سے خطاب کر کے اپنی نظم "بجے نی" (فتحیاب) لکھی (۱۹۲۰ء) یہ نظم "چھایا نٹ" اور "پوبیر ہوا" دونوں میں شامل ہے۔ یہ نظم ان کی عشقیہ شاعری میں بہت ہی اہمیت رکھتی ہے۔

یہ زمانہ نذرالاسلام کے لئے بہت ہی نازک زمانہ تھا۔ ایک طرف پہلی شادی کی ناکامی نے انھیں بیتاب کر رکھا تھا۔ دوسری طرف انھیں یقینی طور پر معلوم نہ تھا کہ پرمیلا سے ان کی جو محبت ہے اس کا مستقبل کیا ہے؟ اس تردد نے ان کے دل کو اور زیادہ بے چین کر دیا تھا۔ وہ عرصے کے بعد کومِلا سے کلکتہ چلے تو گئے مگر دردِ فراق سے ان کا دل بے قرار تھا۔ ان کی شاعری پر اس کا گہرا اثر پڑا۔ "دولن چاپا" کے بہت سے عشقیہ گانے جو انھوں نے پریسیڈنسی جیل میں لکھے تھے اسی دردِ فراق کا نتیجہ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ پرمیلا کے عرفی نام دُلی یا دولن ہی کے مطابق اس کتاب کا نام "دولن چاپا" رکھا گیا ہے۔

بہرحال چھ مہینے تک نذرُالاسلام کا ندیہ پاڑہ (کومِلا) میں رہے۔ مختلف نظمیں اور گیت لکھتے رہے۔ بعد ازاں کلکتہ چلے گئے۔

"دھوم کیتو" کی اِشاعت، ۱۹۲۲ء

۱۱ اگست ۱۹۲۲ء (۲۶ ساون ۱۳۲۹ء) کو نذرالاسلام نے کلکتہ سے عوام کے رگ و پے میں ہمت و جرأت کا خون دوڑانے والا مشہور سہ روزہ اخبار "دھوم کیتو" شائع کیا۔ اور اپنے شعلہ بار قلم سے ملک میں آگ برسانے لگے۔ "ترکِ موالات" کی تحریک ماندپڑ گئی تو وہ دہشت پسند تحریک کی طرف مائل ہوگئے۔ انھوں نے اس اخبار سے اس تحریک کی بڑی حمایت کی۔ کھلے الفاظ میں ہندوستان کی پوری آزادی کا مطالبہ پیش کیا۔

۱۳ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو نذرالاسلام نے "دھوم کیتو" میں لکھا:۔

"اولاً "دھوم کیتو" ہندوستان کی پوری آزادی کا مطالبہ کرتا ہے ہندوستان کی چپّہ بھر زمین بھی بدیسی کے قبضے میں رہنے نہ دی جائے گی۔ ہندوستان کی پوری ذمہ داری، اس کی آزادی کا تحفظ یہاں کی حکومت کا انتظام سب کچھ ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہوگا۔ اس میں بدیسی کو مداخلت کا کوئی حق نہ ہوگا۔ اب جن حکمرانوں نے بیجا دخل اندازی سے اس ملک کو گورستان بنا رکھا ہے، انھیں مع سازو سامان سمندر پار روانہ ہونا پڑے گا۔ منت سماجت سے دال نہیں گلے گی۔ اب تک ان میں اتنی سمجھ بوجھ کہاں! اس لئے ہمیں بھی التجا کرنے یا بھیک مانگنے کی بے وقوفی کا مرتکب ہرگز نہ ہونا چاہیئے۔"

اُس زمانے میں جبکہ آزادی کے علمبرداروں کے خلاف حکومتِ برطانیہ کی سخت کارروائیاں جاری تھیں ایسا دلیرانہ بیان دینا ضرور ایک حیرت انگیز بات تھی۔

"دھوم کیتو" کے پہلے ہی نمبر میں نذرُالاسلام کی معرکتہ الآرا نظم "دھوم کیتو" (دمدار ستارہ) چھپی۔ اس نظم میں انھوں نے اپنے کو دھوم کیتو سے تعبیر کیا۔ عام طور پر دھوم کیتو منحوس خیال کیا جاتا ہے۔ شاعر نے بھی اس کا اعتراف کیا اور کہا کہ میں تمام ظالموں کے لئے ایک زحمت بن کر آیا ہوں مگر مظلوموں کے لئے باعث رحمت ہوں۔ ظالموں کا دل دہلانے اور ایک انقلاب عظیم برپا کرنے کے لئے طلوع ہوا ہوں۔ میں تمام چیرہ دستیوں کو کچلنے اور موجودہ نظام کو مسمار کر کے نیا نظام قائم کرنے آیا ہوں۔ میں شیطان کا دوست ہوں۔ طاغوتی شرارتوں سے بخوبی واقف ہوں میں ان شرارتوں کو کچل دوں گا۔ میں آگ ہوں۔ چیتا ہوں۔ میرے سینے میں آگ بھڑک رہی ہے۔ اس آگ میں "بھگوان" یعنی صاحب اقتدار ظالم جو مصنوعی طور پر بھگوان بن بیٹھا ہے، جل بھن کر راکھ ہو جائے گا۔ "دھوم کیتو" کی چند سطریں ملاحظہ ہوں:۔

میں ـــــ ہر دور میں آیا کرتا ہوں۔ پھر انقلاب عظیم برپا کرنے آیا ہوں۔
میں ـــــ اس خالق (سماجی نظام کا خالق) کے لئے زحل اور خطرناک تباہی کا
دمدار ستارہ بن کر آیا ہوں۔
میں ـــــ اس خالق کا دھوکہ اور اس کی عیاری خوب جانتا ہوں۔
اس لئے ـــ آئین و قانون پر لات مار کر ناظم عالم کے سینے پر ہتھوڑا مارتا ہوں۔
میں ـــــ خوب جانتا ہوں کہ اس جھوٹے ایشور سے اب تک جو کچھ نہ بن پڑا وہ بھی ہو کے
رہے گا۔
اس لئے ـــ انقلاب لاتا ہوں، بغاوت کرتا ہوں۔ ناچ ناچ کر مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوں
تیرے ـــ بے شمار جہنموں کو پھونک سے بجھا دیتا ہوں۔ موت کے منہ پر تھوک دیتا ہوں
اور ـــ جو جس قدر غصے میں آتا ہے اس کے اسی قدر خطرناک آگ کی گردش کرتا
ہوں ـــ
میرے ـــ فضائی تیر کی ترچھی رفتار زنّاٹہ بجاتی ہے۔

میری ـــــــ زہریلی سانس ظالم حکمرانوں کو بھی خوفِ ہلاکت سے لرزا دیتی ہے۔
اے دُنیا کے لوگو! سُنو!
وہ (ندرل) تمہارے پروردگارِ عالم کا 'چیتا' ہے!
اے قدرت! کیا تجھے معلوم ہے کہ اس چیتا کی آگ میں جگمگتا ایشور (سلطانِ عالم) جل کر
راکھ ہو جائے گا۔
تو کیا کہتا ہے؟ پھر کہہ دے بھائی! میں شیطان کا دوست ہوں۔
واہ واہ! 'بھگوان' کو جلانے کے لئے میں نے اپنے سینے میں چیتا جلا رکھا ہے۔

نذرالاسلام کی نظمیں "بدروہی" اور "دھوم کیتو" ان کی شاعری میں امتیازی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان نظموں میں ان کی بغاوت کا روپ شدّت وحدّت کے ساتھ نمایاں ہوا ہے۔ ان کی "انانیت" کا پورا پورا ظہور ہوا ہے۔ انھوں نے "بدروہی" میں کہا:۔

"میں نے یکایک اپنے آپ کو پہچان لیا ہے،
میری تمام رکاوٹیں دور ہو چکی ہیں"

ان نظموں میں منتشر اور متضاد خیالات کا اجتماع نظر آتا ہے۔ یہاں شاعر ایک طرف بغاوت کا عَلم بلند کرتے ہیں، تو دوسری طرف رومانیت کے شکار ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ صرف بغاوت کے شاعر نہیں حسن کے بھی شاعر ہیں۔ اس لئے بغاوت کی تندی میں بھی وہ حسن وجمال کے ترانے گائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ وہ اپنے کو خدا سے بہت قریب سمجھتے ہیں اور شوخی کرتے ہوئے کبھی کبھی اس سے بغاوت کر بیٹھتے ہیں۔ یہ دراصل خدا سے بغاوت نہیں بلکہ اپنے دل کی بیتابی کا اظہار ہے۔ حقیقت میں ان کا روئے سخن خدا سے نہیں بلکہ ظالموں سے ہے۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ مشیتِ الٰہی کے بغیر کوئی فعل خواہ نیک ہو یا بد، وجود میں نہیں آسکتا۔ نذرالاسلام نے ظالموں کو یوں متنبہ کیا کہ اے ظالمو! تمہاری طاقت کتنی بڑی کیوں نہ ہو، وہ میرے سامنے ہیچ ہے۔ میں اُسے مسمار کر دوں گا۔ تم کیا! حتیٰ کہ خدائی مشیت جو سب سے بڑی قوت ہے، اُسے بھی اپنی خودی کی قوت سے اپنے ارادوں کے سانچے میں ڈھال لوں گا۔

اقبال نے بھی تو کچھ ایسی ہی بات کہی ہے ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

" دھوم کیتو" ملک کے مظلوم اور مفلوک الحال عوام اور دہشت پسند جماعت کی آواز تھی۔ تحریکِ ترک موالات کی ناکامی کی وجہ سے جنگِ آزادی کے رہبران تو جب پسپا ہونے لگے، تو اس اخبار نے ان میں ہمّت اور گرمی پیدا کی۔ حکومت کی چیرہ دستیوں کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے شائع ہوتے کے بعد ہی سے نذرالاسلام پر حکومت کی کڑی نگرانی ہونے لگی۔ وہ حکومت کی نگاہوں میں کانٹا بن کر کھٹکنے لگے۔ اس اخبار کی آتش بیانی کا اثر یہ ہوا کہ ملک کے گوشے گوشے میں حکومت کے خلاف بیزاری کا اظہار کیا جانے لگا۔ اس اخبار میں شاعر کی کتاب "اگنی بینا" اور "بشیر بانشی" کی بہت سی آتشیں نظمیں شائع ہوئیں۔ بعد میں اس اخبار کے منتخب اداریوں سے "رودر مینگل" (خطرناک بہتری) اور "دُردِنیر جاتری" (منحوس وقت کا مسافر) کے نام سے دو کتابیں شائع ہوئیں۔

کاتک، ۱۳۲۹ سنہ (۱۹۲۲ء) میں نذرالاسلام کی کتاب "اگنی بینا" شائع ہوئی اور بازار میں اس کی مانگ روز بروز بڑھنے لگی۔ بنگلہ زبان کی کسی اور کتاب کو شاید ہی اتنی جلد اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی ہو۔ اس کتاب کی زیادہ تر نظمیں تحریکِ خلافت اور تحریکِ ترک موالات کی ہنگامہ خیز فضا میں لکھی گئی تھیں۔

اسی زمانے میں جب چاروں طرف ملک میں آزادی کی لہر دوڑ رہی تھی تو شاعر نے ملک کو سنایا:-

بھائی! آج تم اپنے جان و دل اللہ کے نام پر قربان کر دو۔

نذرالاسلام قید خانہ میں ۱۹۲۳ء

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا (اقبال)

پوجا کی تقریب میں جب نذرالاسلام نے "دھوم کیتو" میں اپنی نظم "آنند میر آگمنے" (درگا دیوی کی مسرت بھری آمد) شائع کی (۲۲ ستمبر ۱۹۲۲ء) تو یہ اخبار حکومت کی زد میں آگیا۔ اس نظم کے کچھ ٹکڑے جو انہوں نے درگا دیوی کو مخاطب کر کے لکھے ہیں، ملاحظہ ہوں:۔

ہر سال یہ رسم پرستی تیری توہین ہے، یہ پوجا نہیں۔
کروڑوں اولاد کو چھری کی سلامی کے بدلے تو یہ کیا دعا دے رہی ہے!
بہت سے بکرے اور بھینسیں تو نے کھائیں۔ پھر بھی تیری بھوک نہیں مٹی۔
اے سنگ دل! اس دفعہ تو اپنی اولاد دل کے خون کا امرت لے جا۔
کمزوروں کو بھینٹ چڑھا کر بزدلوں کی یہ پوجا پاٹ تو بند کر دے۔
اے ماں! تو کہہ دے ـــ "ماں اپنی اولادوں کا خون چاہتی ہے۔"

شاعر کے خلاف سمن جاری کئے گئے اور انھیں کوملا سے گرفتار کر کے کلکتہ میں چیف پریزیڈنسی مجسٹریٹ کی عدالت میں حاضر کیا گیا۔ نذرالاسلام نے عدالت میں جو بیان دیا ہے وہ اس ملک سیاسی بیداری کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ یہ بیان ۱۲ ماگھ ۱۳۲۹ (۱۹۲۳ء) کو شائع ہوا۔ جو بعد میں کتابی شکل اختیار کر گیا۔ اس کے کچھ ٹکڑے ملاحظہ ہوں:۔

"میں شاعر ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے چھپی ہوئی صداقت کو ظاہر کرنے اور کائنات کی مخفی حقیقتوں کو بروئے کار لانے کے لئے بھیجا ہے۔ شاعر کی زبان اللہ تعالیٰ کی زبان ہے۔ میری شاعری حقیقت کا اظہار ہے۔ یہ خدا کا پیغام ہے۔ یہ کلام شاہی دربار میں تو قابل گرفت ہو سکتا ہے مگر مذہب کی روشنی اور صداقت کی نگاہ میں بے قصور، بے خطا، تر و تازہ، غیر افسردہ اور حقیقت کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ . . . .

مجھے کوئی ڈر نہیں۔ کوئی دکھ نہیں۔ اس لیے کہ خدا میرے ساتھ ہے۔ میرا نامکمل فرض دوسروں کے ذریعے پایۂ تکمیل کو پہنچے گا۔ صداقت کو کبھی روکا نہیں جا سکتا۔ میرے ہاتھ کا "دھوم کیتو" اس مرتبہ خدا کے ہاتھ میں مشعلِ آتش بن کر ظلم و ستم کو جلا دے گا۔ تمہارا خدا خود اپ کی دفعہ میرے آتشی ہوائی جہاز کا سربراہ ہوگا۔"

حکومت سے بغاوت کرنے کے الزام میں ۸ جنوری ۱۹۲۳ء کو انھیں ایک سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ "دھوم کیتو" کچھ دنوں کے بعد بند ہو گیا۔ نذرالاسلام کچھ دنوں تک علی پور سنٹرل جیل (کلکتہ) میں رہے پھر ہگلی جیل میں منتقل کر دیئے گئے۔ قید کی سزا ان کی زبان بند نہ کر سکی۔ ان کا آتش بار قلم چلتا ہی رہا۔ انھوں نے ہگلی جیل خانے میں "شکل پرارگان" (زنجیر پہننے کے گانے) "شیا رنبدنا" (جیل سپرنٹنڈنٹ کا گیت) "مرن برن" (استقبالِ موت) "سیبک" (خادم) "سرستی شکیرا" سے (تخلیق کی خوشی میں) اور دوسرے گانے لکھے۔ "شکل پرارگان" کے دو بند ملاحظہ ہوں۔ ان میں شاعر نے حکومت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے کہا کہ ہم حکومت کو تباہ کرکے ہی دم لیں گے۔ اور اپنی جان کی بازی لگا کر بھی ملک میں امن و امان قائم کریں گے۔

"ہمارا زنجیر کا پہننا ایک بہانہ ہے اور کچھ نہیں
یہ زنجیر پہن کر ہی ہم تمہاری زنجیروں کو برباد کر دیں گے۔
ہم تمہارے قید خانے میں قیدی بننے نہیں آئے۔
بلکہ سب لوگوں کو قید کے ڈر سے بے پروا بنانے آئے ہیں۔
یہ زنجیر بندھے پاؤں نہیں۔ زنجیر توڑ چکے ہیں۔

تم طاقت کے بل بوتے پر حکومت کر رہے ہو، اپنے کارناموں کی بدولت نہیں۔
ہم اس طاقت کا گلا گھونٹ کر اسے تباہ کر دیں گے
ہم خود مر کر مُردوں کے اس ملک میں امن و امان قائم کریں گے۔
ہم سولی پر چڑھ کر مریں گے اور خوشی بحال کریں گے۔

ہگلی جیل خانہ میں سیاسی قیدیوں کے ساتھ عام قیدیوں کا سا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ ہر نوع کے قیدیوں پر ظلم و ستم ڈھائے جاتے تھے۔ نذرالاسلام نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور متواتر انتالیس روز تک بھوک ہڑتال جاری رکھی۔ حکومت کی اس بدسلوکی کے خلاف ملک میں زوردار تحریک شروع ہوئی۔ ملک کے رہنماؤں نے ان کی بھوک ہڑتال توڑنے کی کوشش کی۔ مگر وہ اپنے مطالبہ پر قائم رہے۔ اور اپنی برت توڑنے پر راضی نہیں ہوئے۔ ان کی نازک حالت سے واقف ہو کر رابندر ناتھ ٹیگور نے شیلانگ سے ان کے نام تار بھیجا:۔

"بھوک ہڑتال چھوڑیئے، ہمارے ادب کو آپ کی ضرورت ہے۔"

اسی وقت ٹیگور نے اپنے ناول "بسنت" کو ان کے نام معنون کیا تھا۔ ان کی بھوک ہڑتال کے انتالیسویں روز دیس بندھو چت رنجن داس کے زیر صدارت کلکتہ میں ایک بڑا مجمع عام ہوا جس میں جیل خانے کے کارکنوں کی بدسلوکیوں کے خلاف احتجاج کیا گیا۔ ملک کے رہنماؤں نے شاعر سے بھوک ہڑتال ختم کرنے کی درخواست کی عوام کے دباؤ سے حکومت نے شاعر کے مطالبات مان لینے کا وعدہ کیا تو انھوں نے بھوک ہڑتال ختم کر دی۔ کچھ دنوں کے بعد ہگلی جیل خانے سے انھیں بہرم پور جیل خانے میں منتقل کر دیا گیا۔ وہ یہاں سے بھی مختلف اخباروں میں اپنی نگارشات بھیجتے رہے۔

قید سے رہائی ۱۹۲۳ء

۱۵ دسمبر ۱۹۲۳ء میں نذرالاسلام کو قید سے رہائی ملی۔ چھٹکارہ پاتے ہی وہ کوملا چلے آئے۔ ۱۹۲۳ء میں "بنگیا ساہتیہ پریشد" (مدناپور شاخ) کے زیر اہتمام ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ نذرالاسلام مدعو ہو کر مدناپور گئے تو اس انجمن نے ان کا پرتپاک استقبال کیا۔ شاعر نے وہاں چار دن قیام کیا۔

نذرالاسلام کی دوسری شادی اور ہگلی میں اُن کا قیام ۱۹۲۴ء

۲۵ اپریل ۱۹۲۴ء کو کلکتہ میں گری بالا دیوی کی بیٹی پرمیلا سین گپتا سے ان کی دوسری شادی ہوئی۔ مشہور ناول "ماں۔ او میئے" کی لکھنے والی مسز ایم۔ رحمٰن کے زیر اہتمام اس شادی کی رسم انجام پائی۔ شادی کے بعد وہ اپنی اہلیہ کے ساتھ ہگلی میں سکونت پذیر ہوگئے۔ اس وقت انھیں سخت تنگدستی کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر بھی ان کی ادبی سرگرمیوں میں کوئی فرق نہ آیا۔ ان کی نظم "صبح امید" "مکتی کام"، "سجھر"، "پھالگونی "چاندنی رات"، "پوبیر ہوا"، "دیبا نتر یہ بندیہ"، "چرکار کان"، "کرشانیر گان" "سامو" وغیرہ اسی وقت (۱۳۳۱ء ۔ ۱۳۳۲ ب) کی یادگار رہیں۔ اسی زمانے میں ان کا پہلا بیٹا آزاد کمال پیدا ہوا۔ کچھ دنوں کے بعد اس بیٹے کا انتقال ہوگیا۔

۱۹۲۵ء میں دیس بندھو چترنجن کا انتقال ہوا۔ اس موقع پر شاعر نے بہت سی نظمیں اور مرثیے لکھے جو بعد میں "چتو نامہ" کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ ہگلی کے دوران قیام میں شاعر نے سیاسی تحریکوں میں زبردست حصہ لیا۔ اسی وقت وہ بنگال کے صوبائی کانگریس کمیٹی کے رکن بھی بنے۔

نذرالاسلام کے زیر نگرانی "لانگل" کی اشاعت، ۱۹۲۵ء

۱۶ دسمبر ۱۹۲۵ء کو کلکتہ سے نذرالاسلام کے زیر نگرانی "مزدور پرجا سوراج پارٹی" کا ہفتہ وار اخبار "لانگل" شائع ہوا۔ شاعر کی مشہور نظم "سامو بادی" (مساوات کا قائل) اس کے پہلے نمبر کی زیب و زینت تھی۔ دوسرے نمبر (یکم جنوری ۱۹۲۶ء) میں ان کی نظم "کرشانیر گان" (کسان کا ترانہ) اور تیسرے میں "سبو ساچی" (یکم جون) شائع ہوئی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ہندوستان کے سیاسی میدان میں ایک موڑ آ رہا تھا۔

عوام کے دل میں برٹش سامراج کے خلاف آتشیں جذبہ موجزن تھا۔ وہ کسی مصالحت کے بغیر طاقت کے زور سے حکومت برطانیہ کی بیخ کنی کرنا چاہتے تھے۔ اس ہنگامہ خیز ماحول میں نذرالاسلام نے ظلم و استبداد کے خلاف گرج دار آواز بلند کی۔ ان کی احتجاجی نظموں نے نوجوانوں کے دلوں میں بارود کا کام کیا۔ شاعر نے "مساوات" کے موضوع پر چند نظمیں لکھیں ان نظموں نے ملک میں سنسنی پھیلادی یہ نظمیں سرمایہ داروں کے مظالم اور طبقاتی امتیازات کے خلاف اعلانِ جہاد تھیں۔ اسی وقت شاعر نے اپنے کو "بے نوا دُں کا شاعر" کہہ کر فخر محسوس کیا۔ اس وقت ان کے دل میں انسان دوستی کا جذبہ منتہائے کمال پر نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں سے اقتصادی مذہبی اور سیاسی امتیازات کو رفع کرنے کی کوشش کی انسانیت کے احترام پر بہت زور دیا۔ دُنیا کے سامنے یہ حقیقت صاف صاف پیش کردی کہ انسان و انسان میں کوئی فرق نہیں۔ ہر انسان خدا کی مخلوق ہے۔ ہر انسان کا دل خانۂ کعبہ سے بھی زیادہ معزز ہے انسان اشرف المخلوقات ہے۔ لہٰذا ایک انسان کی ذلت پوری انسانیت کی ذلت ہے۔ یہ گویا کسی فارسی شاعر کی آواز بازگشت ہے ـــــ

؎ از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

نذرالاسلام فرماتے ہیں :۔

اس دل سے بڑھ کر کوئی کعبہ یا مندر نہیں ۔

انسان سے بڑا کچھ نہیں۔ کچھ بھی اس سے زیادہ معزز نہیں ۔

نذرالاسلام کی "مساوات" کے سلسلے میں یہ بات ذہن میں رکھنا مناسب ہے کہ ان کی یہ مساوات اشتراکی مساوات نہیں کمیونسٹوں کی نظریاتی مساوات نہیں بلکہ یہ مظلوم انسانیت کے لئے ان کے ہمدردانہ جذبات کی ایک تصویر ہے۔

نذرالاسلام کرشنا نگر میں، ۱۹۲۶ء

۳ جنوری ۱۹۲۶ء کو ہیمنت کمار کی التماس پر نذرالاسلام ہگلی چھوڑ کر مع اہل و عیال کرشنا نگر چلے آئے۔ ۲ اپریل ۱۹۲۶ء کو کلکتہ میں "راج راج الیشوری جلوس" کے موقع پر فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوئے تو شاعر نے اپنا مشہور گیت "کانڈاری ہوشیار" (ناخدا ــ ہوشیار!) لکھ ملک کے رہنماؤں کو کانگریس کی جھڑپوں کے خطرناک انجام سے آگاہ کیا۔ اور ان کی سرگرمی میں ہندو اور مسلمانوں میں باہمی اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان کا یہ گانا ۲۲ مئی ۱۹۲۶ء کو کرشنا نگر میں صوبائی کانگریس کے اجلاس میں پہلی دفعہ گایا گیا۔ اور "بنگوبانی" جیٹھ ۱۳۳۳ء میں شائع ہوا۔ آجکل یہ گانا مشرقی پاکستان کی سیاسی اور ثقافتی محفلوں میں اہتمام کے ساتھ گایا جاتا ہے جس دن کرشنا نگر میں صوبائی کانگریس کا اجلاس ہوا تھا اسی دن کرشنا نگر میں "مزدور سوراج پارٹی" کے زیر اہتمام ایک اور جلسہ منعقد ہوا۔ جس کے لئے شاعر نے "دھنگس پیتھر جاتری دل" (راہِ ہلاکت کا قافلہ) اور "اٹھ رے چاشی جگت باسی، دھر کسے لانگل" (ارے کسانو! اٹھو ہل کو مضبوطی سے پکڑ لو) کے عنوان سے دو گیت لکھے۔ اسی دن وہاں "نوجوان طلبا کانفرنس" کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔ اس کانفرنس کے لئے انھوں نے "چھاتر دلیر گان" (طلبا کا گیت) لکھ کر نوجوان طلبا میں آزادی کا جذبہ اور قربانی کا ولولہ پیدا کرنے کی کوشش کی

اس وقت نذرالاسلام کی تمام نگارشات میں انسانی میل ملاپ اور ہندو مسلم اتحاد پیدا کرنے کا انتہائی جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ اسی زمانے میں لکھی ہوئی ان کی نظمیں ـــــ "ہندو مسلم جُدھ" (ہندو مسلم کی جنگ)، "پتھیر دِسا" (رہنمائی) اور ان کا مضمون "مسجد و مندر" اسی سلسلہ کی قابل قدر کڑیاں ہیں۔

نذرالاسلام ڈھاکہ میں، ۱۹۲۶ء

۱۵؍اپریل ۱۹۲۶ء میں "لانگل" بند ہوگیا۔ نذرالاسلام کو بھی اس مصروفیت سے رہائی ملی۔ انھوں نے مداری پور کی "دھیبر کانفرنس" (ماہی گیر کانفرس) میں شرکت کی اور وہاں سے ہیمنت کمار سرکار کے ہمراہ ڈھاکہ تشریف لائے اور ۲؍جون ۱۹۲۶ء کو "مسلم ساہیتہ سماج" کے پہلے سال کے چوتھے اجلاس میں شریک ہوئے اور قومی بیداری کے کئی گانے سنائے۔ نوجوانوں میں آزادی کا ولولہ اور روشن مستقبل کی اُمنگ پیدا کی۔ ۲؍جولائی کو انھوں نے نرائن گنج میں "ابھیجان" (مہم) کے عنوان سے ایک اور نظم لکھی۔ اسی زمانے میں وہ ڈھاکہ ڈویژن سے "مرکزی قانون ساز اسمبلی" کی رکنیت کے اُمیدوار ہوئے تھے۔ نومبر ۱۹۲۶ء میں مشرقی بنگال کے انتخابات شروع ہوئے مگر نتیجہ شائع ہونے سے پہلے ہی وہ کرشنا نگر واپس چلے گئے۔ (۲۳؍نومبر ۱۹۲۶ء) نذرالاسلام جیسے تنگدست آدمی کے لیے انتخاب کے بھاری مصارف برداشت کرنا ممکن نہ تھا۔ انتخاب کا نتیجہ ظاہر ہے

چاٹگام کا سفر، ۱۹۲۶ء

جولائی ۱۹۲۶ء کے آخر میں نذرالاسلام نے چاٹگام میں "کل بنگال طلبا کانفرنس" کا افتتاح کیا۔ کانفرنس کے بعد شاعر نے کچھ دنوں مشرقی پاکستان کے سابق صوبائی وزیر اور ممتاز ادیب حبیب اللہ بہار کے گھر میں قیام کیا۔ بہار صاحب اور ان کی مرحومہ بہن بیگم شمس النہار محمود (۱۹۰۹ء – ۱۹۶۴ء) نے اس زمانے میں طلبا کی تحریکوں میں بڑا نام پیدا کیا تھا۔ ان کے ہمراہ شاعر نے چاٹگام کے مختلف مقامات کا دورہ کیا۔ ان کے گھر میں

رہ کر نذرُالاسلام نے بہت سی نظمیں لکھیں۔ ۲۷ رجولائی کو "انامکا" (بے نام محبوبہ) اور ۲۸ رجولائی کو گوپن پریا (مخفی محبوبہ) لکھیں۔ ان کی کتاب "سندھو ہندول" کی کئی نظمیں اس زمانے کی یادگار ہیں۔

۱۲ اگست ۱۹۲۶ء کو کامریڈ مظفر احمد کے زیرِ ادارت "لانگل گنبائی" (نوائے عام) کے نام سے دوبارہ (کلکتہ سے) شائع ہوا۔ اس رسالے میں نذرُالاسلام کے بہت سے گانے نظمیں اور مضامین شائع ہوئے۔ "لانگل" اور "گنبائی" کے دور میں ان کی شاعری میں مظلوم اور غریب انسانوں کے لیے بیتابی نظر آتی ہے۔ اس وقت انھوں نے کس مپرسی کے عالم میں پڑے ہوئے لوگوں کے جذبات کو ایک نئے روپ میں پیش کیا۔ ان میں جمہوریت کی عظمت و اہمیت کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انھیں ایک روشن مستقبل کی بشارت دی۔ ان کی کتاب "فنی منسا" (ایک خاردار پودا) اور "سرب ہارا" (بے نوا) کی شعلہ بار نظمیں ان کی اس رجائی اور ہمدردانہ جذبات کی آئینہ دار ہیں۔

کرشنا نگر میں ۹ اکتوبر ۱۹۲۶ء کو نذرُالاسلام کا دوسرا بیٹا بلبل پیدا ہوا۔ اس کے نام پر انھوں نے اپنی غزلوں کی پہلی کتاب کا نام "بلبل" رکھا۔ کرشنا نگر کے دورانِ قیام میں نذرالاسلام کو بڑی تنگدستی کا شکار ہونا پڑا۔ ان کی مشہور اور مقبول نظم "دارِدر" (مفلسی) کرشنا نگر کی یادگار ہے۔ علاوہ ازیں ان کی نظمیں "دے مورا مہکار" (یہ میرا ناز ہے) اور "اگر دیتھک" (پیش رو مسافر) یہیں لکھی گئیں۔ ان کے ناٹک "کھیلکا" اور "مرتو کھدا" بھی اسی سرزمین کی نشانیاں ہیں۔ "مرتو کھدا" کا اردو ترجمہ رفیع احمد فدائی صاحب نے کیا ہے۔ یہ ترجمہ "مجموعِ الاجل" کے نام سے شائع ہو گیا ہے۔

۱۹۲۶ء سے شاعر کی زندگی میں ایک نیا موڑ نظر آتا ہے۔ اس سال سے وہ گیتوں اور غزلوں کی تخلیق میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ اسی وقت سے ان کی غزلوں اور گیتوں میں گہرائی اور نئے نئے سروں کی تخلیق میں انفرادیت نمودار ہونے لگی۔ انھوں نے اپنی غزلوں اور گیتوں میں نئے نئے سُروں کا اضافہ کر کے بنگلہ ادب میں ایک نیا باب کھول دیا۔ ۸ ہزار فروری

۱۹۲۷ء کو انھوں نے ڈھاکہ میں "مسلم ساہیتہ سماج" کے پہلے سالانہ اجلاس کا افتتاح کیا۔
آساڑھ ۱۳۳۴ء (۱۹۲۷ء) میں محمد فضل الحق کے زیر ادارت کلکتہ سے ماہانہ "نوروز" شائع ہوا۔ اس رسالہ میں نذرالاسلام کے ناول "کُہیلکا" (شبنم) کا پہلا حصہ، اور ان کے ناٹک "جھلی ملی" اور "ستو بند" شائع کئے گئے۔ "نوروز" پانچ دفعہ شائع ہونے کے بعد بند ہو گیا۔ "کُہیلکا" کا باقی حصہ قسط بہ قسط "ہفتہ وار سوغات" میں چھپتا رہا۔ علاوہ اریں ان کا ناول "مرتو کھدا (موت کی بھوک) اسی رسالے میں اگھن ۱۳۳۴ء سے شروع ہو کر پھاگن ۱۳۳۶ء میں ختم ہوا۔ "مرتو کھدا" کا کردار انصار اور "کہیلکا" کا کردار جہانگیر نذرالاسلام کی آزادانہ زندگی کی تصویریں ہیں۔

نذرالاسلام پھر ڈھاکہ میں ۱۹۲۸ء

مارچ ۱۹۲۸ء پہلے ہفتہ میں نذرالاسلام نے ڈھاکہ "مسلم ساہیتہ سماج" کے دوسرے سالانہ جلسہ کا افتتاح کیا۔ اس موقع پر انھوں نے اپنا مشہور گانا "چل چل چل! اُوردھو گگنے بجے مادل" (چل چل چل: آسمان بر ہے پر طبل جنگ بج رہا ہے) سنایا۔ ان کی کتاب "چوکھیر چاتک" کے کئی گانے اسی وقت کے لکھے ہوئے ہیں۔ اسی سال اکتوبر میں شاعر "سورما بھیلی اسٹوڈنٹس کانفرنس" کے موقعہ پر سلہٹ میں خصوصی مہمان کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے۔

نذرالاسلام پھر کلکتہ میں۔ چاٹگام کا دوبارہ سفر ۱۹۲۹ء

تنگ دستی اور ملیریا سے عاجز آکر ۱۹۲۹ء کے آخر میں نذرالاسلام کرشنا نگر چھوڑ کر کلکتہ چلے گئے۔ اسی زمانے میں انہوں نے چاٹگام اور سندیپ کا سفر کیا۔ اس سے پہلے ۱۹۲۶ء کے وسط میں بھی انہوں نے ایک دفعہ چاٹگام کا سفر کیا تھا۔ پہلے سفر کی طرح ان کا

یہ سفر بھی بہت دلچسپ رہا۔ اس سفر نے ان کے شاعرانہ تخیل پر زبردست اثر چھوڑا۔ اور بہت سے شاہ پاروں کو جنم دیا۔ کامریڈ مظفر احمد سے نذر الاسلام کی بڑی دوستی تھی۔ وہ چاٹگام سے سندیپ گئے اور مظفر احمد صاحب کے گھر مہمان رہے۔ ان کے گیتی ناٹک "مدھو مالا" میں خلیج بنگال اور سندیپ کا ذکر ہے۔ اس ناٹک کی ہیروئن — مدھو مالا سندیپ کی راج کماری ہے۔ شاعر نے جاڑے کے موسم میں سندیپ کا سفر کیا تھا۔ اس وقت خلیج بنگال کی فضا پرسکون تھی۔ ان کی نظم "سرماکا سمندر" میں اس پرسکون فضا کی عکاسی کی گئی ہے۔ ان کی کتاب "سندھو ہندول" اور "چکرباک" (ایک قسم کی چڑیا) کی بہت سی شاہکار نظمیں اور بھاٹیالی سُر میں لکھے ہوئے بہت سے ملاحی کے گانے اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ یہ نظمیں اور گانے کہیں سمندر کی طغیانی، کہیں روانی، کہیں گہرائی اور کہیں رومانی کیفیت لیے ہوئے ہیں۔ ان میں چاٹگام اور سندیپ کے مناظر فطرت کی رعنائیاں نظر آتی ہیں۔

پہلے سفر کی طرح اس سفر کے دوران بھی نذر الاسلام مشرقی پاکستان کے ادیب اور سابق صوبائی وزیر حبیب اللہ بہار کے گھر (چاٹگام) تشریف لے گئے اور کچھ دنوں وہاں قیام بھی کیا۔ انھیں حبیب اللہ بہار اور ان کی بہن بیگم شمس النہار محمود سے گہری محبت تھی انہوں نے اپنی کتاب "سندھو ہندول" کو ان دونوں کے نام معنون کرکے اس محبت کا اظہار کیا ہے۔ چاٹگام میں لکھی ہوئی بہت سی نظمیں اس کتاب میں شامل ہیں۔ یہ وہ نظمیں ہیں جن کے مطالعہ سے خلیج بنگال اور چاٹگام کے فطری مناظر کا نقشہ ہماری آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔

قوم کی جانب سے نذر الاسلام کو تہنیت سنہ ۱۹۲۹ء

۱۵ ردسمبر سنہ ۱۹۲۹ء کو البرٹ ہال (کلکتہ) میں قوم کی طرف سے شاعر کا پرتپاک استقبال کیا گیا۔ پرپھلا رائے نے جلسہ کی صدارت کی۔ جلسہ میں شاعر کو مختلف تحائف سے نوازا گیا۔

اس جلسے کے سپاسنامہ کا جواب دیتے ہوئے نذرُالاسلام نے کہا۔
"میں نے جو کچھ دیا ہے، اس سے کس کو کس قدر سیری ہوئی ہے، وہ مجھے معلوم نہیں۔ ہاں یہ بات مجھے معلوم ہے کہ اب تک میں خود کو پورے طور پر نہیں دے سکا۔ اور دینے کی پیاس اب تک نہیں بجھی۔ میں اونچے پربت کی چوٹی سے اُترا ہوا ہوں۔ اور سمندر کے آبِ رواں کا طلبگار رہوں۔ آپ دعا فرمائیں کہ میری وجہ سے اس پربت کی چوٹی کی عظمت پر کوئی حرف نہ آنے پائے۔ ریگستان کی راہ میں مجھ پر کبھی گمراہی طاری نہ ہو۔........... اگرچہ میں اس ملک اور اس معاشرہ میں پیدا ہوا ہوں تاہم میری ذات صرف اسی ملک اور اسی معاشرہ کے لئے نہیں۔ بلکہ ہر دور اور ہر انسان کے لئے ہے حُسن کی مدّاحی اور حُسن کا دھیان ہی میری عبادت اور میرا مذہب ہے۔"

نذرُالاسلام کے گانوں کی روزافزوں مقبولیت دیکھ کر ریڈیو، کلکتہ نے انہیں نئی راگ راگنیوں کی تخلیق کے لئے مقرر کیا (۱۹۳۰ء)۔ انھوں نے کلکتہ ریڈیو کے "ہارامنی" (گم شدہ جوہر) کے پروگرام میں بہت سے گم شدہ اور فراموش کردہ سُروں کو دوبارہ زندہ کیا۔ علاوہ ازیں انہوں نے نئے نئے سُروں اور گانوں سے بھی فنی مہارت کا ثبوت دیا۔ ۱۹۳۱ء کے وسط میں وہ سینما اور اسٹیج سے بھی متعلق رہے۔ ان کی نئی نئی راگنیوں اور گانوں نے اس میدان میں بھی ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔

جیسا کہ ۱۳۳۷ء میں کلکتہ سے ماہانہ "جیتی" شائع ہوا۔ اس کے پہلے نمبر میں نذرُالاسلام کی نظم "چاندنی راتے" اور "جاگو ناری جاگو بنھی شکھا" (عورتو! جاگو آگ کی چنگاری جاگو) شائع کی گئی۔ اسی زمانے میں (۱۹۳۰ء) شاعر کے چار سالہ بیٹے بُلبُل نے وفات پائی بیٹے کے مرضِ موت میں اس کے سرہانے بیٹھ کر انھوں نے رباعیاتِ حافظ کا منظوم (بنگلہ) ترجمہ کیا۔ اس کا کچھ حصہ "جیتی" کے جیٹھ نمبر ۱۳۳۷ء میں شائع ہوا۔ ان کا مزاحیہ گیت "ہتے بپ ریت" (نیکی کے بدلے بدی) بھی اس رسالہ کے ساون نمبر میں چھپوا لیا گیا۔ یہ گیت بعد میں "چندر بندو" میں شامل کر لیا گیا۔ حکومت نے اس کتاب کو ضبط کر لیا۔ اسی زمانہ (۱۹۳۱ء)

ہیں جب "پرلئے شکھا" شائع ہوئی تو اس کی تین نظموں کے لیے حکومت وقت نے اُسے بھی ضبط کرلیا۔ ایسی شاعر پر بغاوت کا الزام عائد کیا اس پر مقدمہ چلایا گیا۔ اور کورٹ نے ان پر چھ مہینے کی قید بامشقت کا حکم صادر کیا۔ مگر ۴ مارچ ۱۹۳۱ء کے گاندھی۔ اَرون معاہدہ کی بدولت انھیں قید سے رہائی مل گئی۔

نذرالاسلام کی ذہنیت میں ایک نیا موڑ، ۱۹۳۲ء

۵ نومبر ۱۹۳۲ء کو "بنگیو مسلم تردن سمیلن" سراج گنج میں صدارت کرتے ہوئے نذرالاسلام نے کہا۔

'آج میں انھیں لوگوں کے ساتھ ہوں جو کارکن ہیں ــــ مفکر ہیں۔۔۔۔ میری تحریک بات یہ ہے ــــ ہم شباب کے پجاری، نئے نئے امکانات کے پیش رو اور جدتوں کے علم بردار ہیں۔ ہم دُنیا کی ترقی پذیر قوموں کے دوش بدوش چلتے رہیں گے۔ جو اس راہ میں حائل ہوگا، ہماری مخالفت اسی سے ہے۔ تند و تیز ہوا کا گھونگر دہن کر ہم ناچتے ہوئے طوفان کے مانند بہتے چلے جائیں گے۔ جو رہنے کا ہے وہ رہ جائے گا اور جو لوٹنے کا ہے وہ ہمارے پاؤں کی ٹھوکروں سے ضرور لوٹ جائے گا۔۔۔'

"ہم ابوبکر صدیق رضؓ کی سچائی، عمرؓ کی بہادری اور وسیع النظری، علیؓ کی ذوالفقار، حسن و حسینؓ کی قربانی اور صبر و استقلال چاہتے ہیں۔ ہم خالدؓ اور موسیٰ۔ طارق کی تلوار اور بلالؓ کا عشق چاہتے ہیں۔ ہم یہ اوصاف اپنا سکیں تو آج دُنیا میں جو لوگ فتح و نصرت کے علم بردار ہیں انھیں کے ساتھ ساتھ ہمارے نام بھی بصد احترام لئے جائیں گے۔"

اسی زمانے سے ان کی ذہنیت میں ایک صاف تبدیلی نظر آتی ہے۔ پیارے بیٹے بُلبُل کی وفات (۱۹۳۰ء) کے بعد ہی سے ان کے دل پر سوگ کی گھٹائیں چھانے لگیں، وہ

روحانیت کی طرف جھکتے گئے اور سالک کی تعلیمات سے بہرہ یاب ہونے لگے، غور وفکر
کے ساتھ مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرنا شروع کیا مگر ۱۹۳۲ء سے وہ ملک اور قوم کی براہ راست
خدمات سے الگ تھلگ ہو کر غزل اور گیتوں کی تخلیق میں منہمک ہو گئے اور ان کی نگارشات
میں روز افزوں رومانیت اور روحانیت اُبھرنے لگی۔ جنھوں نے ایک دفعہ یہ کہا تھا:۔

بہادر! کہہ دے ——
کہہ دے ـــ میں ہمیشہ سربلند ہوں۔
میرے سر کو دیکھ کر ہمالہ کی چوٹی بھی سرنگوں ہو جاتی ہے۔

(بدروہی)

اب وہ یہ کہنے لگے: ——
میں گلستاں کا بلبل ہوں۔
"رنگین عشق" کی غزل گاتا ہوں۔
فرطِ اشتیاق کی سرخ شراب سے۔
میری آنکھیں جھلملا رہی ہیں۔

(گل باغیچہ)

۱۹۳۳ء میں انھوں نے قرآن مجید کے پارۂ عم کا بنگلہ زبان میں منظوم ترجمہ کیا۔ ۱۹۳۶ء
میں "فرید پور مسلم طلبہ کانفرنس" کی صدارت کرتے ہوئے انھوں نے کہا:۔
"فی الحال میں نے اپنے ارادے سے ۱۰بی، ملکی اور قومی خدمات سے الگ ہو کر سنگیت
کے بحر الکاہل کے جزیرے میں جلا وطنی اختیار کرلی ہے۔"
۸ اور ۹ اپریل ۱۹۳۸ء کو انہوں نے کلکتہ میں "بنگیو مسلم ساہیتہ سمیلن" کے شعبۂ
شاعری میں صدارت کی اور اپنے خطبۂ صدارت سے ادباء و شعراء کو محوِ حیرت کردیا۔

نذرالاسلام پھر "نوجوگ" میں، سنہ ۱۹۴۰ء

اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء میں مولوی اے۔ کے فضل الحق مرحوم کی سیاسی پارٹی کا ترجمان "روزانہ نوجوگ" کلکتہ سے دوبارہ شائع ہوا تو نذرالاسلام پھر اس کے مدیر مقرر ہوئے۔ اور قومی وملکی خدمت کے میدان میں اتر پڑے۔ مگر تقدیر نے انھیں زیادہ دنوں تک خدمات کا موقع نہیں دیا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد وہ مرض کے شکار ہو گئے۔ انہوں نے اپنے ملک کے آزاد منش مجاہدوں کو ان الفاظ میں عہد نو قائم کرنے کی دعوت دی۔

"ہم دشوار گذار راستے پر پھر چلیں گے۔
دوستو! تم پہلے کی طرح زندگی کے سیل رواں پر واپس آجاؤ۔
میں روپوش ہو گیا تھا۔ "نوجوگ" مجھے پھر کھینچ لایا ہے۔
تم نہ آؤ گے تو نیا دور کیوں کر وجود میں آسکتا ہے؟

اس وقت "روزانہ نوجوگ" اور ماہانہ "سوغات" میں ان کی جو نظمیں شائع ہوئیں، ان میں سے بعض نظمیں شاعر کی کتاب "نتون چاند (ہلال) اور شیش سوغات (آخری سوغات) میں شامل کر لی گئیں۔

سنہ ۱۹۴۰ء کے آخر میں آخری دفعہ نذرالاسلام ڈھاکہ تشریف لائے اور بن گرام کے "پاکستان کلب" میں تقریر کی۔ ڈھاکے سے واپس ہو کر ۲۳ دسمبر سنہ ۱۹۴۰ء کو انہوں نے کلکتہ میں "مسلم طلبہ کانفرنس" کی صدارت کرتے ہوئے کہا:۔

"آپ کو معلوم رہے کہ مجھے اللہ کے سوا کسی اور کی خواہش نہیں۔"

۱۶ مارچ، سنہ ۱۹۴۱ء کو بنگاؤں (چوبیس پرگنہ) کی ادبی کانفرنس میں صدارت کرتے ہوئے کہا:۔

"میں شاعر نہ عظمت کا خواہاں ہو کر پیدا نہیں ہوا۔ میں اس دنیا میں اپنی قوت کو ڈھونڈھنے آیا تھا۔ مجھے اس کا سراغ مل گیا ہے۔ . . . . . . آپ نے مجھے ادبی

کانفرنس میں ادب کے متعلق بات چیت کرنے کے لئے بُلایا ہے۔ "MYSTICISM"
کی حقیقتیں سُننے کے لئے بلایا ہے۔ کیا ہے مگر آپ کو دیر ہو گئی ہے۔ وہ دن بیتے جس طرح
اور جس زبان میں بول سکتا تھا، آج وہ بھول گیا ہوں۔ اس "MYSTICISM" یا "MYSTRY"
میں جو مٹھاس اور مزہ مجھے ملا ہے، اس سے میرا کلام شیریں اور شیریں اور صرف شیریں ہے"

نذرالاسلام کا آخری خطبہ ۱۹۴۱ء

۵ اپریل ۱۹۴۱ء کو کلکتہ کے مسلم انسٹی ٹیوٹ ہال میں "بنگیا مسلم ساہیتہ سمیتی" کی
رجت جوبلی" (سلور جوبلی) کے موقع پر نذرالاسلام نے صدارت کی۔ اس جلسہ میں انہوں
نے اپنی زندگی کے آخری خطبہ میں کہا:-

"میں ایک شاعر کی حیثیت سے نہیں بول رہا ہوں ــــ آپ حضرات مجھ سے
محبّت رکھتے ہیں اس محبّت کے تقاضوں پر بول رہا ہوں ــــ اگر میری بانسری اور
نہ بجی، تو آپ مجھے معاف رکھیں۔ مجھے بھول جائیں۔ یقین کیجئے ــــ میں شاعر بننے نہیں
نہیں آیا تھا۔ نمائندہ بننے نہیں آیا تھا ــــ میں محبت کا رشتہ جوڑنے آیا تھا۔ محبّت پانے
آیا تھا ــــ مجھے محبّت نہیں ملی۔ اس لئے میں اس بے مہر اور بے درد پھیکی دُنیا سے اپنا
مار لئے ہوئے چپ چاپ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا ہوں ا.... .

ہندو مسلم دن رات فتنہ و فساد، فرقہ وارانہ بغض و حسد اور جنگ و جدل
میں مبتلا ہیں۔ انسانی زندگی میں ایک طرف سخت مفلسی، قرض کا وبال اور تنگ دستیاں
ہیں مگر دوسری طرف دیو پیکر حریصوں کے 'بینک' میں کروڑوں روپیوں کے ڈھیر لگے
ہوئے ہیں ــــ اس عدم مساوات اور امتیازات کو مٹانے کے لئے میں آیا تھا۔ میں
نے اپنی شاعری، سنگیت اور عمل سے مساوات کی خوبیوں کا بول بولا کیا ــــ
آپ اس پر گواہ ہیں۔ اور میرا حسنِ ازل (خدا) بھی اس پر گواہ ہے۔"

۱۹۴۵ء میں کلکتہ یونیورسٹی نے شاعر کی تخلیقی صلاحیتوں کے احترام میں انھیں "جگت تارنی" کے نام سے ایک طلائی تمغہ عطا کیا۔ ۱۹۶۰ء میں حکومت ہندوستان نے انھیں "پدم بھوشن" کے لقب سے نوازا۔

افسوس! صد افسوس! یہ غیر معمولی شاعر کئی ہزار گیتوں اور گوناگوں سُروں کے خالق۔ ۱۰ اگست ۱۹۴۲ء کو ایک لا علاج مرض میں مبتلا ہوگئے اور ان کی زہریلی بانسری ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی۔ ہزار علاج معالجہ کیا گیا مگر ؎

"مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی"

وہ خاموش ہو گئے۔ ان کے لب اور نہیں کھلے۔ بنگلہ ادب کے اُفق پر ان کا طلوع "دھوم کیتو" کی طرح اچانک ہوا تھا، ان کا غروب بھی اچانک ہوگیا۔ فی الحال وہ کلکتہ میں اپنی زندگی کی باقی گھڑیاں گذار رہے ہیں۔ ہر سال گیارہویں جیٹھ کو ملک کے گوشے گوشے میں "نذرالاسلام" (نذرالاسلام کی سالگرہ) منائی جاتی ہے۔ اور ہر انسان کے دل سے یہ آہ بھری آواز نکلتی ہے —— الٰہی! نذرالاسلام کو شفاء کلّی عنایت فرما!

آج ہمیں نذرالاسلام کے وہ الفاظ یاد آتے ہیں جو خود انہوں نے اپنے متعلق کہے تھے۔

دوستو! میں تمہاری طرف آنکھ اُٹھا کر پھر نہیں جاگوں گا۔
دن بھر غل غپاڑہ کر کے کسی کا دھیان نہیں بٹاؤں گا۔
نڈھال اور چپ چاپ
اکیلا اپنے دل ہی دل میں خوشبو دار صندل کی طرح جلتا رہوں گا!۔

نذرالاسلام کی شاعری کا ایک مختصر جائزہ

نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر
نرا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتش ناک

(اقبال)

نذرالاسلام کی شاعرانہ زندگی نہایت ہی مختصر ہے۔ پہلی جنگ عظیم کا آخری حصہ ۱۹۱۷ء اور دوسری جنگ عظیم کا درمیانی حصہ ــــــ ۱۹۴۲ء، اس درمیان کی یہ پچیس سالہ مدت ان کی شاعرانہ زندگی ہے۔ اس مختصر عرصے میں انہوں نے بنگلہ زبان وادب کو مختلف حیثیتوں سے حیرت انگیز طور پر فروغ دیا۔ شاعری کے مزاج میں تبدیلی پیدا کی۔ ہر صنف شاعری میں نے باب کا اضافہ کیا زبان کو نئے سانچے میں ڈھالا۔ شاعری کو انسانی زندگی سے قریب تر کر دیا بورژوا ادب کو عوامی ادب بنایا۔ محلوں سے نکال کر جھونپڑوں سے اس کا رشتہ جوڑ دیا۔ غرض انہوں نے غیر معمولی جودتِ طبع اور ذہانت سے بنگلہ زبان وادب میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ انہیں کارناموں نے ان کو دنیا کے عہد آفرین شعراء کی صفِ اول میں لا کھڑا کیا۔

بنگلہ ادب، نذرالاسلام سے پہلے اور ان کے بعد

نذرالاسلام نے اس وقت شاعری کے میدان میں قدم رکھا، جب بنگلہ ادب میں رابندر ناتھ (۱۸۶۱ء - ۱۹۴۱ء) کا ڈنکا بج رہا تھا۔ تمام شعراء ان کی کورانہ تقلید کر رہے تھے۔ مروجہ شاعری سے سرمو انحراف کرنا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ استاذ الاساتذہ ٹیگور کے طرز کو چھوڑ کر کسی نئی راہ کی تلاش کا خیال تک کسی کے دماغ میں نہیں آسکتا تھا۔ بیشک گنی چنی دو چار ہستیاں مثلاً ستیندر ناتھ دت، کرن دھن، کمد رنجن، جیتندر موہن باگچی، کالی داس رائے نے تو اپنی انفرادیت قائم کرنے کی

کوشش کی مگر بالآخر وہ بھی ٹیگور کی مقناطیسی قوت میں جذب ہو کر رہ گئے۔ البتہ ستیندر ناتھ دت (۱۸۸۲ء۔۱۹۲۲ء) اور گوبند داس نے شاعرانہ تکنیک اور طرزِ تحریر میں مروّجہ رسوم و قیود سے بالاتر ہو کر اپنا راستہ الگ قائم کر لیا تھا۔ موہت لال مجومدار (۱۸۸۸ء۔۱۹۵۲ء) اور جتیندر ناتھ سین (۱۸۸۸ء۔۱۹۵۴ء) نے شاعری کو عوام کے جذبات کا ترجمان بنا کر اپنے طرز میں انفرادیت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ غرض معدودے چند کے سوا سب ہی ٹیگور کے اتھاہ سمندر میں غوطہ زن رہے۔

بے شک نذر الاسلام نے شروع شروع میں ٹیگور کی تقلید کی۔ ان کی انسان دوستی اور فطرت پرستی سے استفادہ کیا۔ زندگی بھر ان کی عظمت اور استادی کا اعتراف کیا "اسرو پشپانجلی" (مٹھی بھر آنسوؤں کے پھول) کے عنوان سے ایک نظم (نتون چاند) لکھ کر انہیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ علاوہ ازیں انہوں نے کچھ دنوں تک ستین دت، جتیندر ناتھ سین اور موہت لال مجومدار کی سماجی اصلاحات اور ترقی پسند رجحانات سے بھی اثر قبول کیا تھا مگر قدرت نے ان کی ذات میں ایک بے پناہ صلاحیت ودیعت کی تھی۔ بہت ہی جلد ان کا اپنا جوہر پھوٹ نکلا زیادہ دنوں تک انہوں نے کسی کا اتباع گوارہ نہ کیا۔ انہوں نے اپنی غیر معمولی ذہانت اور بلند شخصیت سے بنگلہ زبان و ادب کی تاریخ میں اپنی انفرادیت کا ثبوت دے کر ایک قابلِ رشک مقام حاصل کر لیا۔ بیس پچیس سال کی شاعرانہ عمر میں ہر دل عزیزی حاصل کر لی یا مائیکل مدھوسدن دت (۱۸۲۴ء۔۱۸۷۳ء) اور رابندر ناتھ ٹیگور کے پہلو بہ پہلو سب آخری شاعر ہونے کا شرف حاصل کیا۔ ٹیگور کے اثر سے بالاتر ہو کر نئی صنف کی نظمیں لکھیں اور ترقی پسند شاعری کے بانیوں میں اپنا نام درج کرایا۔

ٹیگوری دور کا ادب بڑی حد تک "بورژوا ادب" تھا۔ وہ ادب شرفاء، تعلیم یافتہ اور متوسط طبقے کا ترجمان تھا۔ غیر ملکی اور سرمایہ دارانہ نظامِ حکومت کے زیر اثر پھلتا پھولتا جا رہا تھا۔ اس ادب پر تعلیم یافتہ برہمن ہندوؤں کے تمدن کی گہری چھاپ تھی۔ وہ ادب نام نہاد شریفوں کے جذبات و احساسات اور ان کی امیدوں اور نا امیدیوں کی آئینہ داری کرتا تھا۔ بنگال کے

عوام، ان کی حسرت و مسرت اور ان کے خیالات و تصورات سے اس کا واسطہ نہ ہونے کے برابر تھا۔

پہلی جنگ عظیم سے پہلے تحریکِ آزادی اعلیٰ طبقوں میں محدود تھی۔ عوام میں آزادی کا احساس نہ ہونے کے مترادف تھا جنگ کی تباہیوں نے پوری دنیا میں ہلچل مچا دی۔ روس میں "بالشویک تحریک" (۱۹۱۷ء) کی کامیابی دیکھ کر دنیا کے عوام میں آزادی اور خود ارادیت کا جذبہ ابھرنے لگا۔ اطرافِ عالم میں انقلابی آب و ہوا چھانے لگی۔ اور کائنات کے گوشے گوشے میں وقت کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی نظام سے بیزاری کی لہر دوڑ گئی پاک و ہند اس کے اثر سے کیسے مستثنیٰ رہ سکتا تھا یہاں بھی اس کا ردِ عمل شروع ہوا۔ ملوکیت اور سرمایہ دارانہ نظامِ حکومت کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہونے لگی۔ یوں تو ملک بھر میں تحریکِ خلافت اور تحریکِ ترکِ موالات زوروں پر تھیں مزید براں جلیان والا باغ کے قتل کا واقعہ، ظالمانہ "رولٹ آئین" اور حکومت کے دیگر گوناگوں مظالم نے آگ پر تیل کا کام کیا۔

ادب، جو کہ زندگی کا ترجمان ہے، اس نازک حالت میں متاثر ہوئے بغیر کیسے رہ سکتا تھا۔ ہر ملک میں ادب نے ایک نئی کروٹ لی۔ ادب سے زندگی کی الجھنوں کو سلجھانے کی کوشش کی جانے لگی۔ بنگلہ ادب پر بھی کم و بیش اس کا اثر پڑا۔ ٹیگور نے "آمرا چلی سمکھ پانے" (ہم آگے بڑھتے چلتے ہیں) "کے آما دیر باندھبے ؟" (کون ہمیں روکے گا)، "اورے نبین ! اورے آمار کانچا" (اے نوجوانو! اے میرے نونہالو!) جیسی پُر زور نظمیں لکھ کر عوام میں احساسِ آزادی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ قومی بیداری پر ان کے چند الفاظ ملاحظہ ہوں :۔

اے نوجوانو ! اے میرے نونہالو !
اے نوخیزو ! اے میرے نادانو !
تم نیم جانوں کو ٹھوکر سے جگا کر انہیں آفت سے بچا لو
آج تمام چہ میگوئیاں چھوڑ چھاڑ کر
متوالی صبح کے وقت شراب سرخ پی کر
تم اپنا بازو اٹھا کر نچا دُ

اے ہمت والو ! اے میرے نونہالو ! تم آجاؤ

کیا زنجیر اور غلامی کی پوجا
ہمیشہ برقرار رہے گی ؟
اے مستی ! تو دروازہ توڑ کر آجا
اے جوان مستو ! اے میرے نونہالو !
تم طوفاں کی طرح فتح مندی کا پرچم لہرا کر،
قہقہوں سے آسمان چیر کر،
" بھولاناتھ " کی تھیلیوں کو انڈیل کر،
موٹی موٹی غلطیاں ہی سہی ، بیتی کر و ۔

پھر بھی بنگلہ ادب کو نذر الاسلام جیسے آتش فشاں شاعر کی ضرورت تھی ۔ اس لئے کہ ٹیگور کی آواز میں ایسا اثر نہ تھا جس سے ظالموں کے دل میں نرمی ، مظلوموں کے خون میں گرمی اور حکومتِ وقت کے ذہن میں تبدیلی پیدا ہو سکتی ۔ ٹیگور کو انسانیت سے ہمدردی ضرور تھی اور معاشرتی کمزوریوں کا بھی احساس تھا ، وہ مظالم کے خلاف انقلاب لانا چاہتے تھے ۔ مگر وہ حسن کے پجاری ، روحانیت کے پیاسے اور عالمگیر اخوت و محبت کے خواہاں تھے اور پوری دنیا کو محبت کے رشتے میں جوڑ لینا چاہتے تھے ۔ اسی لئے ان کا احتجاجی شعر اور آواز کی بلندی آخر تک برقرار نہ رہ سکی وہ سرزمینِ بنگال کے رہنے والے تھے مگر بنگال کے شہری ہونے سے زیادہ پوری دنیا کے شہری تھے اور پوری دنیا کے امن و امان کے آرزو مند تھے ۔ گاندھی جی افریقہ سے واپس آکر سرزمین پاک و ہند میں سیاسی تحریکوں کو ہوا دینے لگے تو ٹیگور نے خیال کیا کہ میں جس عالمی اتحاد کا خواب دیکھ رہا ہوں ، وہ ان انقلابی اور مخالفانہ اقدامات سے شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا ۔

اس حالت کے پیشِ نظر وہ گاندھی جی کی اس تحریک کی حمایت کیسے کر سکتے تھے ؟ یہی وجہ

ہے کہ انہوں نے اس وقت شانتی نکیتن (بول پور، ضلع بردوان) میں "بشو بھارتی" کی بنیاد ڈال کر اس سے اپنے خواب کو عملی جامہ پہنانے کا سہارا ڈھونڈھا۔ بے شک تحریکِ تقسیم بنگال (۱۹۰۵ء ـ ۱۹۱۱ء) میں ٹیگور اور ان کے ہم عصر شعرا نے زبردست حصہ لیا تھا۔ مگر ترکِ موالات (۱۹۲۰ء ـ ۱۹۲۲ء) اور خلافت (۱۹۱۹ء) کی تحریکوں میں بنگال کے لوگ ان سے حسبِ توقع کچھ نہ پاکر مایوس ہونے لگے اور منتظر تھے کہ کوئی مردِ مجاہد میدان میں آئے تاکہ وہ انہیں جہادِ زندگی میں صف آرا ہونے کی دعوت دے اور ان کا جمود توڑ کر ان کی رگِ حمیت میں جوش و انقلاب کی لہر دوڑا دے۔ اس نازک وقت میں نذرالاسلام عوام کے جذبات کی تصویر بن کر ان میں رونما ہوئے اور اپنے سیلابی زور سے قوم کے پرانے جمود کو بہالے گئے۔ مست جوانی کے ترانے گاگا کر نوجوانوں میں جوش و خروش کی لہر دوڑائی۔ شباب سے مخاطب ہوکر فرماتے ہیں۔

مست شباب! تو جاگ اٹھ۔ طوفان کی طرح آجا
جو کچھ سامنے ملے، جوش و خروش کی رو میں پامال کئے جا۔
فراخ دلی، پُرزور روانی اور تیزی کو ساتھ لئے آجا۔
اس سے ساحل کا خس و خاشاک بہ جائے، تو کیا مضائقہ ہے؟
سینہ سپر ہو کر دکھ درد کو گلے سے لگا۔ دل کھول کر مسکراتا جا۔
آزادی بعد میں ہوگی ــــــ پہلے تو تازہ بتازہ گیت گاتا جا۔
سمندر میں بے خطر کود پڑ۔ بلند پہاڑوں کی چوٹی پر چڑھ جا۔
راستے میں موت ملے، تو دوست سمجھ کر اسے گلے سے لگالے!

(ڈربار جوبن، نتون چاند)

اگرچہ نذرالاسلام کو رابندر ناتھ ٹیگور کی طرح ادب کے مختلف شعبوں میں غیر معمولی ملکہ حاصل نہ تھا پھر بھی اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کو خاکِ بنگال سے والہانہ محبت تھی۔ بنگال کے عوام کے لئے ان کے دل میں ایک پُرخلوص جذبہ موجزن تھا۔ عوام پر نکبت اور ادبار

کی گھٹائیں چھاتے دیکھ کر ان کا دل چاک چاک ہو رہا تھا۔ عام انسانیت کو ظلم وستم کا شکار دیکھ کر اس کی نجات کا خواب دیکھ رہے تھے۔ بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائیاں ملک کی بڑی منحوس گھڑیاں تھیں۔ ملوکیت کے زیر اثر سرمایہ دار طبقہ اپنے ہتھکنڈوں سے رات دن مزدور کا خون چوس رہا تھا۔ مہاجن اور زمیندار فریب، عیاری اور دغابازی سے کسانوں کو ان کے پیدائشی حقوق سے محروم کر رہے تھے۔ مظلوم عوام بے زبان، مایوس، مقروض اور مفلوج ہو کر رہ گئے تھے۔ اس نازک وقت میں نذرالاسلام قوم اور ادب کے افق پر نمودار ہوئے۔ وہ فرعونیت کیلئے موسیٰ بن کر آئے۔ ایک بہادر اور مردِ مجاہد بن کر طاغوتی طاقتوں کا سر کچلنے کے لئے انہوں نے مسلمانوں کو ان الفاظ میں جہاد کی دعوت دی۔

اے لوگو! تم چلے آؤ!
اس عظیم الشان سمندر پار سے طبل جنگ
کی مسلسل آواز سنائی دے رہی ہے۔
اے لوگو! تم چلے آؤ!
دیکھو ——— اسلام ڈوب رہا ہے!
تمام شیطان
سارے میدان میں
اس کا خون خرابہ کر کے نعرہ لگاتے ہوئے
جشن فتحمندی منا رہے ہیں۔
اے لوگو! تم چلے آؤ!
رن کی جھنجھناہٹ سنائی دے رہی ہے۔

(رن بھیری، اگنی بینا)

مذکورہ بالا الفاظ ان کی نظم رن بھیری سے ماخوذ ہے۔ یہ نظم نذرالاسلام نے اس وقت لکھی، جب ترکی حکومت یونانیوں کے خلاف لڑ رہی تھی کمال پاشا کی مدد کے لیے ہندوستان

سے دس ہزار رضاکار سپاہی بھیجنے کی تجویز پیش کی گئی تھی یہ خبر سن کر نذرالاسلام بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے یہ نظم لکھ کر مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دی۔ اس نظم سے انہیں اس بات پر آگاہ کیا کہ ہم سنہری روایات کے مالک ہیں شہیدوں کے فرزند ہیں۔ ہم شہادت قبول کر سکتے ہیں مگر غلامی برداشت نہیں کر سکتے۔ فرماتے ہیں:۔

ہم سچے سرخ سپاہی ہیں۔
ہم مجاہد ہیں۔ ہم شہیدوں کے بہادر سپوت ہیں۔
ظالموں سے لڑ کر مرتے ہیں۔!
ہم تلوار کی کاٹ اپنے سینے پر لئے ہیں خوشی خوشی مرتے ہیں۔
کامرانی اور آزادی کے گیت گاتے ہیں۔

اے مجاہدو! آجاؤ!
اس بحرِ اعظم کے پار سے مسلسل طبلِ جنگ کی آواز آرہی ہے۔

نذرالاسلام نے حالت کی نزاکت کو بھانپ لیا کہ اگر میں بھی چنڈی داس اور رابندر ناتھ کی طرح ملائم آواز میں انسانی ہمدردی اور عالمی اتحاد کا پیغام سناتا پھروں، دبی آواز میں پریم کا درس دیتا رہوں تو میری آواز بھی صدا بصحرا ثابت ہوگی۔ انہوں نے یہ بھی محسوس کر لیا کہ قوم اصحابِ کہف کی نیند سو رہی ہے اسے جگانے اور ظلم و ستم کے خلاف برسرپیکار لانے کے لئے ایک نئے تعیر اور ایک زبردست انقلاب کی ضرورت ہے۔ سمجھانے بجھانے اور مذہب کی دواؤں سے قوم کا علاج نہیں ہو سکتا۔ انقلاب ہی اس کا واحد علاج ہے۔ سے

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو، تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا، وہ ہنر کیا؟ (اقبال)

اسی خیال سے شاعری کے میدان میں اترتے ہی نذرالاسلام نے مجاہدانہ انداز میں

"صورِ اسرافیل" پھونک کر لوگوں کو جھنجھوڑ دیا۔ شعراء کے دل میں نئی امنگ اور ولولہ پیدا کر دیا جو شعرا ادب میں انقلاب کا خواب دیکھ رہے تھے، مگر رسم و رواج سے بالاتر ہو کر اسے عملی جامہ پہنانے کی ہمت نہیں رکھتے تھے، ان کے لئے نذرالاسلام کی شاعری نے مشعل راہ کا کام دیا۔ انہوں نے اپنی شاعری سے یہ ثابت کر دکھایا کہ ادب اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ادب کو بھی زندگی کی کشمکش میں ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے بنگلہ شاعری کے مزاج میں تبدیلی پیدا کی۔ اس کے روایتی نیازمندانہ سروں میں آگ کی گرمی اور طوفان کی تندی پیدا کی۔ اس کی تسیلی آوازوں کے پہلو بہ پہلو مظلوموں کی آہ پکار کو بھی جگہ ملنے لگی۔ اس میں کمزوری کے بجائے رجائیت رونما ہونے لگی۔ نمونے کے طور پر چند سطریں ملاحظہ ہوں۔

بھائی ہم کشتی نغمہ خواں ہیں۔
ہم محکومی اور دباؤ نہیں مانتے۔
حیات و موت ہمارے تابع ہیں۔
اس ڈراؤنی پھانسی کو دیکھ کر
ہم جیت کی ہنسی خوب ہنستے ہیں۔
ہم تباہی سے بالاتر ہیں۔ ہمیں کوئی ڈر نہیں۔
ہم گیت گائے جاتے ہیں، گائے ہی جاتے ہیں۔
اور اپنے مرے ہوئے دل نکال کر دکھلاتے ہیں
بھائی! راکھ میں دبی ہوئی آگ خطرناک ہوتی ہے۔
ہم قبر کھود دیں گے۔ چتا توڑ دیں گے۔
مرے ہوئے کی ہڈیوں میں جان پھونک دیں گے۔
آخر ہم نظم و نسق کی رحمت کو لا کر ہی دم لیں گے۔

(ڈھیگا نتر یگان، بشیر بانستی)

میں ایسا طاقتور ہوں کہ میں نے قدرت کا نظام توڑ دیا ہے
میرے پاؤں کے تلے بھگوان پامال ہو کر مرتا ہے۔

(ابھیتاپ، بنتیر بالستی)

نذرالاسلام کی شاعری میں انسانی مساوات ایک زندہ حقیقت بن کر سامنے آتی ہے۔ وہ انسانیت کے پجاری تھے۔ دولت کی غیر مساوی تقسیم ان کو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ وہ طبقاتی مراتب اور رنگ و نسل کے امتیازات سے بیزار تھے۔ بنی نوع انسان کے پیدائشی حقوق کو پامال ہوتے دیکھ کر ان کو بڑا دکھ ہوتا تھا۔ اس لئے انہوں نے دنیا کے تمام سیاسی، سماجی اور اقتصادی فرق مراتب پر کاری ضرب لگا کر دنیا کو مساوات کی تعلیم دی۔ بے شک اس سے پہلے بھی ہمیں ستین دت اور چنڈی داس کی شاعری میں مساوات کی تعلیم ملتی ہے جیسا کہ ستین دت نے کہا :-

انسان کالا ہو یا گورا۔ یہ ظاہری فرق ہے
لیکن حقیقت سب کی ایک ہی ہے۔

چنڈی داس نے کہا :

سنو! انسانو! میرے بھائیو!
انسانیت سب سے اوپر ہے۔ اس سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں۔

مگر ان میں انسان دوستی کا وہ کھلم کھلا اعلان کہاں ملتا ہے جو نذرالاسلام کے یہاں پایا جاتا ہے۔ وہ اسلام کے اہم اصول ــــ مساوات کی تعلیم ان الفاظ میں دیتے ہیں۔

آج دنیا بھر میں اسلام کا ڈنکا بج رہا ہے
چھوٹے بڑے کا فرق نہیں سب انسان برابر ہیں۔
کوئی کسی کا راجہ یا رعیت نہیں۔
محل میں رہنے والے! تو کون ہے جو امیر یا نواب یا بادشاہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے؟
تو ہر دور کے انسان کے لئے کلنک کا ٹیکا ہے۔

افسوس! تو نے اسلامی اصول میں شبہ پیدا کر دیا۔

نذرالاسلام کی مساوات اشتراکیوں کی نظریاتی مساوات نہیں۔ یہ ان کے ہمدردانہ جذبات کی پیداوار ہے۔ سماجی تجربات کا نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی 'مساوات' کی آواز نے وہ سماں پیدا کیا جو کمیونسٹوں کی ہزار چیخ و پکار سے بھی ممکن نہیں ہوا۔ اس لئے کہ ان کی آواز میں روس کی بو آتی ہے۔ مگر نذرالاسلام کی آواز ان کے خون جگر کے رنگ سے رنگین ہوئی ہے۔

'دل سے جو بات نکلتی ہے، اثر رکھتی ہے'۔

نذرالاسلام اشتراکی نہ تھے۔ وہ اسلامی اصولوں کے پُرخلوص مبلّغ تھے وہ عرصہ دراز تک مظفر احمد جیسے پکے کمیونسٹ کے ساتھ رہے پھر بھی ان پر کمیونزم کا جادو نہ چلا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ کس قدر اصولی مسلمان تھے۔

نذرالاسلام پہلے مسلمان شاعر ہیں جنھوں نے اسلامی رسوم و روایات کی پوری قدر پہچانی وہ اسلام کی پرانی قدروں کو یاد کرکے نہ خود روئے اور نہ دوسروں کو رلایا بلکہ ان کے سامنے عہد ماضی کی شاندار تصویر پیش کر کے ان کے نبض میں خون دوڑانے کی کوشش کی۔ حضرت عمرؓ، حضرت خالدؓ، موسیٰؒ، طارقؒ، انور پاشا، مصطفیٰ کمال پاشا، زاغلول پاشا مرحوم جیسی نامور ہستیوں کی شجاعت و استقلال کا نقشہ کھینچ کر شاعر نے مسلمانوں کو جوانمردی اور بہادری کے سبق سکھائے۔ فاتحۂ دوازدہم، شط العرب، کھیا پار یر ترنی، قربانی، محرم جیسی تاریخی نظمیں لکھ کر ماضی کی سنہری روایات اور مذہبی جذبات کی طرف ان کی توجہ مبذول کی ان کی نظم انور، کمال پاشا، محرم وغیرہ رزمیہ شاعری کی تاریخ میں بہترین مرقع ہیں۔ اگرچہ انہوں نے ہندو تہذیب و تمدن پر کچھ نظمیں لکھی ہیں۔ مگر ان کی اہم ترین نظمیں اسلامی تہذیب و تمدن ہی پر مشتمل ہیں کھیا پار یر ترنی کے ولولہ انگیز الفاظ ملاحظہ ہوں:۔

پار اُترنے کی کشتی

رات کے وقت مسافر پار اُترنے آئے ہیں

پھر یہ کڑکا کہاں سے آرہا ہے۔ ؟
کون تباہی کا صور پھونک رہا ہے ؟
شمالی مغربی کونے میں تیز ہوائیں چل رہی ہیں۔ ابرآلود آسماں گونج رہا ہے۔

پُرخطر سمندر میں تیز ترنگیں ناچ رہی ہیں۔
موت کی سرمستی اپنی ہیبت ناک صورت میں ہے۔
کالی رات ساری کائنات کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے
کشتی کے تمام بے توشہ گنہگار ڈر کے مارے کانپ رہے ہیں۔

یہ قیامت خیز رات تیرہ و تار ہے۔
کشتی پار لگنے کی کوئی امید نہیں۔ تمام مسافر ڈوبنے لگے ہیں
ٹھہر ٹھہر کر آسمان گونج رہا ہے۔ بجلی کوندرہی ہے۔
صور کی گونج سے رات تھرتھرا رہی ہے۔

پھر یہ کس کی کشتی ہے جو متلاطم سمندر کی تباہی ،
اس کی ہیبت ناک گرج ،
اور اس کی ہلاکت خیز طغیانی کو ہیچ سمجھ کر ،
بے فکری سے آگے بڑھتی جا رہی ہے۔

راہِ راست کے یہ مسافر معصوم ہیں۔
مذہب کی زرہ میں ان کے صاف دل بخوبی محفوظ ہیں۔
یہ بجلی کی تباہی سے بھی خوف زدہ نہیں ہوتے۔

اس کشتی کے ناخدا احمد (صلعم) ہیں۔ یہ کشتی زادِ راہ سے بھرپور ہے۔

ابوبکر، عثمان، عمر، علی حیدر رض
اس کشتی کے چپّو چلانے والے ہیں۔ اس کے لئے کوئی خوف و خطر نہیں؛
اس کشتی کا ناخدا آزمودہ کار ہے
یہ چپّو چلانے والے ہمنوا ہو کر "لاشریک لہٗ" کے گیت گائے جاتے ہیں۔

اس کشتی کے مستول پر شفاعت کا بادبان بندھا ہوا ہے۔
اس پر جنت کی حوریں ڈھیروں پھول برسا رہی ہیں۔
یہ حوریں متواضع ہیں۔ ان کی نگاہیں الفت بار ہیں یہ ہستیاں خیر و برکات کے مجسمے ہیں۔
پار اترنے والے مسافرو! تم ہمنوا ہو کر باآوازِ بلند لاشریک لہٗ کے گیت گائے جاؤ۔

سمندر کی تباہی اور ابر آلود آسمان ان مسافروں کو خواہ مخواہ ڈرا رہا ہے
لو! راہِ راست کے یہ مسافر دریا پار ہوگئے ہیں۔

(اگنی بینا)

اس نظم میں شاعر نے حصولِ نجات کو کشتی پار لگنے سے، حضرت محمد صلعم کو کشتی کے ناخدا سے، خلفائے راشدین کو چپّو چلانے والوں سے، عام مسلمانوں کو کشتی کے مسافروں سے اور منزلِ مقصود تک پہنچنے کی دشواریوں کو پُرخطر سمندر کے شدائد سے تشبیہہ دی ہے اس نظم کا بنیادی خیال یہ ہے کہ مذہب اسلام ہی راہِ نجات ہے۔ رسولِ کریم ؐ اور ان کے صحابۂ کرام رض کے متبعین تمام مصائب و شدائد پر قابو پالیں گے۔ انہیں قیامت کے دن رسولِ کریم ؐ کی شفاعت نصیب ہوگی اور ان کا انجام بخیر ہوگا۔

یہ نظم نذرالاسلام کی شاعرانہ قوت کی ایک زندہ تصویر ہے۔ اس کی موسیقیت، بحر کی

جھنکار، الفاظ کی سلاست و روانی اور اسلوب کی متانت و سنجیدگی کی جتنی بھی تعریف کی جائے، کم ہے۔ اس نظم کے وجود میں آنے کا پس منظر یہ ہے کہ ڈھاکے کے نواب خاندان کی کسی ایک خاتون نے مسلم بھارت میں شائع کرانے کے لئے ایک تصویر بھیجی تھی۔ تصویر کا مفہوم یہ تھا۔ تلاطم خیز سمندر میں ایک کشتی آگے بڑھی جا رہی ہے کشتی کے چار چپّو ہیں اور ایک پتوار۔ چپّوؤں کے سر میں عربی حروف میں ترتیب وار لکھا ہوا ہے ـــ" ابوبکر، عثمان، عمر، علی"۔ یہ اسلام کے چار بڑے خلیفہ ہیں پتوار کے سر پہ محمدؐ اور بادبان میں "شفاعت" کا لفظ مرقوم تھا۔ اس تصویر کا کوئی نام نہ تھا۔ نذر الاسلام نے اس تصویر کو سامنے رکھ کر یہ نظم لکھی۔ اور اس کشتی کا نام 'کھیا پاریر ترنی' رکھا۔

شاعر کی نظم 'قربانی' کی دو سطریں، جو اس کی جان ہیں، ملاحظہ ہوں:۔

آج اللہ کے نام اپنی جان قربان کرنے ہی میں عید کی مقدس روح مضمر ہے۔

قربانی دراصل ذبح جانور نہیں بلکہ یہ حق پرستانہ جذبہ کی بیداری ہے۔

طریق العالم (۱۸۸۹ء ـــ ۱۹۳۲ء) کے نام سے ایک ڈپٹی مجسٹریٹ نے ایک مضمون میں قربانی کو 'بربریت' کی ایک علامت بتایا۔ اس سے نذر الاسلام کے مذھبی جذبے کو ٹھیس لگی۔ انہوں نے یہ نظم لکھ کر رسمِ قربانی کی حمایت کی۔ اور اسے قربانی کی اصل روح سے آگاہ کرتے ہوئے لکھا کہ عید الاضحیٰ کے دن دراصل جانور کا ذبح کرنا مقصود نہیں بلکہ تاسیسِ حق کے لئے عزمِ مصمم کرنا ہی اس رسم کا مقصدِ اوّلین ہے۔

نذر الاسلام مذہبی روایات کے ـــ ـال مزور تھے۔ مگر جوش و جذبہ اور سبق حاصل کئے بغیر صرف رسم کی ادائیگی کو وہ اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ انہوں نے 'محرّم' میں اس روایت پرستی کے خلاف قلم اٹھایا اور کہا کہ محرم کے موقع پر ہم گریہ و زاری اور عزاداری نہیں چاہتے بلکہ قربانی اور ایثار نفسی چاہتے ہیں۔ اس نظم میں انہوں نے مسلمانوں کو اپنے خون کے بدلے پرانی عظمت کو بحال کرنے کی ترغیب دی۔ ہاتھ میں تیغِ عربی لے کر سر پر قرآن کا کفن باندھے میدانِ جنگ میں بے خطر کود پڑنے کی تعلیم دی:۔

آج پھر محرم کا مہینہ آگیا ہے ۔
ہم قربانی چاہتے ہیں ۔ مرثیہ اور گریہ وزاری نہیں چاہتے ۔
مسلمان کے سر پر قرآن کی دستار اور ہاتھ میں تیغ عربی ہے ۔
دنیا میں کسی مسلمان کا سر نیچا نہیں ۔
بس سُن لو ـــ کہاں دمامہ بج رہا ہے ۔
ہاتھ میں شمشیر لے لو ۔ سر پر عمامہ باندھ لو ۔
نقارہ بج رہا ہے ۔ نقیب کا طبلِ جنگ گونج رہا ہے ۔
اسلام ! ہوشیار ہو جا ۔ تیرا آفتاب ڈوب رہا ہے ۔
مسلمانو ! جاگ اٹھو ۔ حیدر کرار کی آواز بلند کرو ۔
شہادت کے دن سب کچھ سُرخ اور سرخ ہو جائے ۔

نذر الاسلام سے پہلے بنگلہ ادب میں اسلامی تہذیب و تمدن کی ترجمانی نہ ہونے کے برابر تھی ۔ انہوں نے اپنی شاعری میں فراخدلی سے اسلامی تہذیب و تمدن کی تصویر کشی کی ہے ۔ ان کا ادب دیکھکر دوسرے مسلمان لکھنے والوں کو اس پر کچھ لکھنے کی ہمت ہوئی وہ سمجھنے لگے کہ بنگلہ ادب پر مسلمانوں کا بھی حق ہے ۔ اس میں اسلامی تہذیب و تمدن کا بیان بھی ہو سکتا ہے ۔

عربی و فارسی زبانوں کے مناسب الفاظ سے نذر الاسلام نے بنگلہ شاعری کی سامعہ نوازی، روانی، گرمی اور اس کے ذخیرۂ الفاظ و معانی میں وسعت پیدا کی ۔ بنگلہ زبان و ادب کی قدیم روایات کے مطابق انہوں نے عشقیہ اور غنائی شاعری میں خود سپاری اور ناز و نیاز کی کیفیت قائم رکھی ۔ مگر عام شاعری خاص کر انقلابی شاعری کو انہوں نے ایک نئی جرأت اور طوفانی کیفیت سے آشنا کیا ۔ بنگلہ زبان و ادب پر ان کا احسان یہیں ختم نہیں ہوتا ۔ سنگیت میں بھی ان کا پایہ بہت بلند ہے ۔ اسی صنف میں ان کی شاعری کا عروج ہوا ہے ۔ اسی میں ان کا شاعرانہ کمال اوجِ کمال پر پہنچا ۔ وہ صرف کئی ہزار گیتوں ہی کے خالق نہیں بلکہ نئی نئی راگ راگنیوں کے بھی رواج دینے والے ہیں ۔ اور اس پہلو میں کوئی بھی بنگلہ ادب میں ان کا ہمسر نہیں آتا ۔ اسی

سے انہوں نے بقائے دوام کے دربار میں اپنا نام محفوظ کرلیا ہے۔ انہوں نے پچیس سالہ شاعرانہ زندگی میں بنگلہ زبان و ادب کو صوری و معنوی دونوں حیثیت سے کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔

آج نذرالاسلام خاموش ہیں مگر ان کے کارنامے ہمیشہ ان کی یاد دلاتے ہیں۔ لوگوں کی زبان پر ریڈیو اور گراموفون پر صبح و شام ان کے گانوں سے لطف اندوز تو ہوتے ہیں مگر ان کے موجودہ حالات کو یاد کر کے ہمارے دل کڑھنے لگتے ہیں۔

نذرالاسلام نے خود کہا تھا :-

میں ایک گانے والا پرندہ تھا۔ کچھ دنوں تمہاری شاخوں پر بیٹھا تھا۔
گانے ختم ہو جانے کے بعد جب میں چلا جاؤں گا۔
تو وہ گانے سدا میری یاد دلائیں گے۔
اس وقت پرندہ تو نہیں رہے گا مگر اس کا شعر ضرور رہے گا
میں تو پرواز کر جاؤں گا ۔۔ مگر تو ریت کا ٹاپو بن کر روتا رہے گا۔

(گویں پریا، سندھو ہندول)

باغی شاعر نذر الاسلام

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر (اقبالؒ)

خداوند کریم کا ارشاد ہے :-

"اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ" خداوند کریم کسی قوم کو ہرگز نہیں بدلتا ہے، جب تک وہ اپنے آپ کو نہ بدلے"

اس کا مطلب یہ ہے کہ خود قوم اگر اپنی زبوں حالی اور ابتری کو خوشحالی اور ترقی سے بدلنے کی کوشش نہ کرے، تو خدا اسے اس کی بدحالی سے نجات دے کر خوش حالی عنایت کرنے پر آمادہ نہیں ہوگا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام ہے :-

"مَنْ رَأٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ، فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ، فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ وَذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ"

اگر تم میں سے کسی کو برائی نظر آئے، تو اسے چاہئے کہ وہ اس برائی کو اپنے ہاتھ سے روک دے۔ اگر ہاتھ سے روکنے کی طاقت نہ ہو، تو زبان سے روک دے، اگر زبان سے بھی روکنے

کی مجال نہ ہو، تو (کم ازکم) دل ہی دل میں اس سے نفرت کرے،
مگر یہ کمزور ترین ایمان ہے "

نذرالاسلام ان ارشادات سے واقف تھے۔ قوم اور ملک کی بے راہ روی کو دیکھ کر ان کی غیرت کے جذبات میں تلاطم پیدا ہوا۔ انہوں نے خاموش تماشائی کا کردار ادا کرنا گوارا نہ کیا۔ قوم کو سدھانے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ انہوں نے اس حقیقت کو کوئی سمجھ لیا کہ تغیر کے بغیر تعمیر کا امکان نہیں۔ اور انقلاب کے بغیر تغیر وجود میں نہیں آسکتا قوت واقتدار حاصل نہ ہو، تو ظلم وستم کا خاتمہ کرنا ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے قوم کو ظالموں کی چیرہ دستیوں اور جکڑبندیوں سے چھڑانے کے لئے وقت کے سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی نظام کے خلاف بغاوت کا اعلان کیا۔ اپنی شعلہ بار نظموں سے سرزمین بنگال میں آگ لگادی۔ خاص کر اپنی طلسماتی نظم بدروہی سے بنگال اور بنگلہ زبان وادب میں ایک عجب ہنگامہ برپا کردیا۔ ظالموں کے دل میں زلزلہ اور مظلوموں کے خون میں شدید گرمی پیدا کردی۔ یہ نظم بنگلہ ادب میں اپنی نوع کی پہلی چیز تھی اسی نے نذرالاسلام کو بنگال کے گوشے گوشے میں باغی شاعر کے نام سے مشہور کردیا۔ وہ بنگال کے جوشِ ملیح آبادی ہیں ایک طرف جوش نے . .

کام ہے میرا تغیر، نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب وانقلاب وانقلاب

کا پیغام سنایا تو دوسری طرف نذرالاسلام نے "بدروہی" اور دھوم کیتو "کی گرج سے ملک کے ظالموں کے دل میں جھرجھری پیدا کردی۔ "بدروہی" اور دھوم کیتو کے نمونے اس نمبر کے مختلف صفحات پر ملاحظہ ہوں) ۔ انہوں نے جس انداز سے قوم کو جگانے کی کوشش کی وہ واقعی ایک اعجاز سے کم نہیں۔

حدیث شریف میں آیا ہے:۔
(افضل الجھاد کلمۃ حق عند سلطان جابر "
"ظالم بادشاہ کے سامنے حق بات کہنا بہترین جہاد ہے۔

نذرالاسلام زندگی بھر اس اصول پر عمل پیرا رہے۔ انہوں نے محبت یا باہمی سمجھوتے سے دشمن کا دل جیتنا پسند نہیں کیا۔ صبر و استقلال سے ظلم کو برداشت کرنا ان کی غیور طبیعت کو گوارا نہ ہوا وہ جانتے تھے کہ ظلم برداشت کرنا بھی ظلم ہے۔ حرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات ہے۔ اس لئے انہوں نے دشمن کو دشمن ہی کی حیثیت سے دیکھا اس کے ساتھ رحم کرنا یا نرمی برتنا روا نہ رکھا ان کا خیال تھا کہ بغیر ہمہ گیر انقلاب کے حکومتِ برطانیہ کو پاک و ہند سے نکالنے کی کوئی اور صورت نہیں، اس لئے گرجدار آواز میں حکومت کو یہ الٹی میٹم دے دیا۔

جو حکومت ظالم ہو
اس کا خون بہانا اور اس کو سیدھا کر دینا چاہتا ہوں۔
اس کے سینے پر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر،
اس کی گردن مروڑ کر خون چوستا ہوں۔
ہم کینہ کش اور گوشت خور ہیں۔
ہم شرارت پسند ہیں۔
دشمن قریب سے ملے تو بھائی!
اس کا کلیجہ کچا چبا کر کھاتے ہیں۔
اس کے مردنی چھائے ہوئے چہرے پر لات مار کر۔
انتہائی مسرت میں پھڑک اٹھتے ہیں۔

نذرالاسلام دراصل جنگ جویانہ تخریب پسند نہ تھے۔ وہ باغی تھے۔ مگر ان کی بغاوت، بغاوت کی خاطر نہ تھی بلکہ تعمیر کی غرض سے تھی ماحول نے انہیں باغی بننے پر مجبور کیا تھا ان کی بغاوت بامقصد تھی۔ ظالموں کے دل دہلانے اور مظلوموں کا لہو گرمانے کا ایک بہانہ تھی ان کا عزم تھا کہ انقلاب اور پیکار اس وقت تک جاری رہے، جب تک کچلی ہوئی انسانیت کو حقِ خود ارادیت نہ مل جائے۔ صفحۂ دہر سے ظلم و ستم کا سیاہ داغ مٹ کر امن و امان اور فرحت و مسرت کا بول بالا ہو اس کی تمنا تھی کہ ایک ایسا سماج وجود میں آجائے جس میں طبقاتی اونچ نیچ نہ ہو۔ ہر فردِ بشر

کو برابر کے حقوق ملیں، جو بدعنوانیوں سے پاک اور عیش و آرام کا گہوارہ ہو۔ فرماتے ہیں:۔

میں بڑا باغی ہوں اور تکالیفِ جنگ سے تھکا ہوا ہوں۔
میں اس دن مطمئن ہوں گا،
جب مظلوموں کی فریاد آسمانی فضا میں نہ گونجے گی
ظالموں کی تلوار و خنجر کی آواز گھمسان لڑائی کے میدان
میں سنائی نہ دے گی۔
میں جنگ کے شدائد سے تھکا ہوا باغی اس دن مطمئن ہوں گا۔

(بدروہی، اگنی بینا)

نذرالاسلام اپنی بغاوت میں ایک روشن مستقبل کا خواب دیکھ رہے تھے۔ وہ ایک جہانِ نو کی بنیاد ڈالنے کے خواہشمند تھے ان کی بغاوت صرف دماغی ہیجان نہ تھا۔ بلکہ اس سے انہیں ایک دائمی اور خوش کن نتیجہ مرتب کرنا منظور تھا۔ وہ دنیا کی دوسری قوموں کی ترقی کے ساتھ ساتھ اپنی قوم اور ملک کو بھی ترقی یافتہ دیکھنا چاہتے تھے اور ایک ایسی مثالی مملکت کی داغ بیل ڈالنا چاہتے تھے جو ساری دنیا کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہو۔ فرماتے ہیں:۔

ہم نئی دنیا بسائیں گے نئے ترانے گائیں گے۔
یہ دنیا سر جھکائے انجلی بھر کر ہمارے احسانات قبول کرے گی۔

نذرالاسلام کی بغاوت بہ ظاہر تباہ کن نظر آتی ہے۔ جیسا کہ انہوں نے خود کہا:۔

میں ہر چیز کو توڑ پھوڑ کر مسمار کر دیتا ہوں۔

شاعر کو بھی اس کا احساس تھا۔ چنانچہ انہوں نے خود اپنی منزلِ مقصود کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ میری تخریب میں تنظیم پوشیدہ ہے۔ تخریب ہی سے تعمیر وجود میں آتی ہے۔ لہذا کسی کو تخریب و تباہی سے ڈرنا نہ چاہئے۔ فرماتے ہیں:۔

تخریب سے تو کیوں ڈرتا ہے؟ تخریب سے تو تعمیرِ نو وجود میں آتی ہے
گم کردہ زندگی کی بے رونقی کو مٹانے کے لئے عہدِ جدید آ رہا ہے

اس لئے یہ طوفان ڈر و نے بھیس میں تباہی لئے ہوئے بھی مسکراتا آ رہا ہے۔
وہ توڑ پھوڑ سے دائمی حسن پیدا کرنا جانتا ہے
تم سب جیت کے نعرے بلند کرو ۔
مولانا رومی نے تخریب و تعمیر کے متعلق کہا ۔
ہر بنائے کہنہ کآ بادان کنند
اوّل آن بنیاد را ویران کنند

شاعر کو جنگ کا تجربہ حاصل تھا ۔ انہوں نے تحفظ آزادی کے لئے نوجوں کو مسکراتے ہوئے جاں بازی کرتے دیکھا ۔ جنگ سے واپس آ کر وہ مجاہدانہ جذبے کے ساتھ شاعری کے میدان میں کود پڑے ۔ اور ملک کی نزاکت حال دیکھ کر ان کا دل کڑھنے لگا ۔ وہ سپاہی شاعر تھے ۔ انہوں نے شاعری کے میدان میں سپاہ سالار اعظم کا کام کیا ۔ ان کے " بگل" سے سر براہ اور نوجوان چوکنے اور چوکس ہو گئے ۔ بہت سے سالار' سپاہی شاعر کی کمان کے تحت میدان میں اتر پڑے اور قوم کی قیادت کی باگ ڈور تھامے غلامی و ناانصافی کے خلاف مہم شروع کر دی ۔

تحریک آزادی کو روکنے کے لئے انگریز حکومت نے دھڑا دھڑ گرفتاریاں شروع کر دیں اور تحریک میں حصہ لینے والوں پر ناگفتہ بہ مظالم توڑے جانے لگے تو نذرالاسلام پسپا نہیں ہوئے ۔ بلکہ اپنی آتشناک شاعری سے حکومت پر آگ برسانے لگے ۔ اگرچہ وہ شروع شروع میں گاندھی جی کی تحریک ترک موالات کے حامی تھے مگر انہوں نے کبھی خاموش عصبی جنگ کرنا پسند نہ کیا بلکہ سامراج کے خلاف مؤثر قدم اٹھانے کے لئے ہمیشہ لوگوں کو اکسایا ۔ قیدیوں کو اتحاد کا سبق دیا اور انہیں اپنے زور بازو سے قید خانے کے در و دیوار ہلا دینے کے لئے بھڑکایا :-

دیکھ ــــ خطرناک بیساکھی طوفان رقص کر رہا ہے ۔
کیا تو ہاتھ پہ ہاتھ دھرے دن گنوا تا رہے گا ؟
آگے چل ـــ
اس بھیانک قید خانے کی بنیاد ہلا دے ۔

قید خانے کے سب تالوں کو توڑ دے ۔

اس میں آگ لگا دے ۔

ضرور آگ لگا دے ! اسے اکھیڑ دے ۔ ا

نذرالاسلام ایک جذباتی اور غیور آدمی ہیں ۔ وہ کبھی کبھی جذبات کی رو میں بہہ کر ہر چیز کو ٹھوکر سے اڑا دینا چاہتے ہیں وہ اپنے وقت کے سیاسی او سماجی نظام سے بغاوت کر کے دم نہیں لیتے بلکہ ظالمانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے خالق یعنی صاحب اقتدار اور جابر حکمرانوں کا بھی قلع قمع کرنا چاہتے ہیں ۔ ان کی نظم بدروہی ، دھوم کیتو ، ابھیشاپ (لعنت) وغیرہ میں اس قسم کی بغاوت کا ظہور بار بار ہوا ۔ شاعر نے بدروہی' میں کہا ۔

میں بھرگو جیسا باغی ہوں ، بھگوان کے سینے پر لات مار دوں گا

میں من مانی کرنے والے ناظمِ عالم کا سینہ پاش پاش کر دوں گا

دھوم کیتو میں کہا ۔

میں اس خالق (سماجی نظام کا خالق) کی کارسازی اور اس کے

تصرفات کی عیاری خوب خوب جانتا ہوں ۔

اسی لئے آئین و قانون پر لات مارتا ہوں ناظمِ اعلیٰ کے سینہ

پر ہتھوڑا مارتا ہوں ۔

ابھیشاپ میں کہا ۔

میں نے اربابِ حل و عقد کا نظام توڑ دیا ہے ۔ میں ایسا ہی طاقتور ہوں

میرے پاؤں کے تلے بھگوان (اربابِ حکومت) موت کی کھا کر مرتا ہے ۔

نذرالاسلام کا دل غریبوں اور مظلوموں کے لئے تڑپ رہا تھا ۔ انسانیت کی نجات ان

ا ہندو دیومالا کا ایک قصہ ہے کہ ایک مرتبہ وشنو بھگوان آرام کر رہے تھے کہ ناگہاں برھماجی کا سرکش بیٹا بھرگو وارد ہوا اور ان کے سینے پر لگ ٹھوکر جڑ دی ۔

کی شاعری کا مطمح نظر تھا۔ انسان اور انسان کا تفنہ، فرقہ وارانہ مناقشات، دولت مند اور سرمایہ داروں کا ظلم وستم، مہاجنوں کا ہتھیا چار، محنت کشوں اور مزدوروں کا دکھ درد دیکھ کر ان سے رہا نہ گیا۔ انہوں نے موجودہ نظام کو توڑنے کے لئے سماج سے بغاوت کی۔ کارکنانِ قضا و قدر سے بغاوت کی۔ پھر جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے انقلاب کا ثمرہ حسب توقع مرتب نہ ہو رہا ہے، دنیا میں امن و اماں قائم نہیں ہو رہا ہے، یورپ اور امریکہ کے گورے آدمی ناز و نعمت میں زندگی گذار رہے ہیں، دھر افریقہ اور ایشیا کے کالے آدمی مصیبتیں جھیل رہے ہیں، انگلستان کے گورے لوگوں کی حکومت ہندوستان کا گلا گھوٹ رہی ہے، دنیا کے انتظامات کی باگ ڈور خونخوار اور جنگجو اقوام کے ہاتھ میں ہے تو ان کا پیمانہ صبر چھلک گیا۔ وہ کارکنانِ قضا و قدر سے آگے بڑھ کر خود قضا و قدر سے بھی چھیڑ چھاڑ کرنے لگے۔ فرماتے ہیں :۔

خدا کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں :۔

تو نے ہی نوع انسان کو گورا، سانولا، کالا پیدا کیا ہے۔ یہ تو تیری ہی مرضی ہے۔

ہم کالے ہیں تو تجھے بخوبی معلوم ہے کہ یہ ہمارا قصور نہیں۔

گورے ہم سبھوں کا گلا گھوٹتے رہیں گے ـــ یہ تیرا نظام نہیں ہو سکتا !

تیری مخلوق آج مجھے رسوا نا رہی ہے۔

تو اتنا ظلم وستم سہے جاتا ہے حالانکہ تو بزرگ و برتر ہے۔

مظلوم انسانیت بے تاب ہو گئی ہے۔ وہ یہ ذلت اور برداشت نہیں کریگی۔!

اقبال کی شاعری میں بھی ایسی شوخیاں پائی جاتی ہیں۔ وہ بھی مسلمانوں کی زبوں حالی اور مغربی ممالک کی ثروت اور خوشحالی کو دیکھ کر خدا سے شکایت کرتے ہیں۔

رحمتیں ہیں تیری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور

اور سجا لئے مسلماں کو فقط وعدۂ حور !

پھر بھی ہم سے یہ گلا ہے کہ وفا دار نہیں
ہم وفا دار نہیں، تو بھی تو دلدار نہیں

یہ چھیڑ چھاڑ درانس خدا سے سرکشی نہیں، شوخی ہے۔ نذر الاسلام نے خود اپنے ناول باندھن ہارا "میں ایسی بغاوت کی تشریح کی ہے۔ اس ناول کا ہیرو نذر الہدیٰ ایک باغی ہے۔ اس کی بغاوت اپنے خالق سے ہے۔ اس ناول میں راویہ کے نام سا مہکا کا ایک طویل خط ہے جس میں نذر الاسلام نے اپنے کردار سا مہکا کے الفاظ میں اس بغاوت کی حقیقت یوں بیان کی ہے۔

یہ بغاوت تو شوخی اور غصّے کا دوسرا نام ہے۔ بیٹا غصے میں آ کر باپ کو باپ نہ کہے، یا ماں کو ماں نہ کہے یا یہ کہے کہ یہ اس کے ماں باپ نہیں تو کیا واقعی باپ کا باپ ہونا یا ماں کا ماں ہونا غلط ہو جاتا ہے؟

جو شوخی بھرا غصّہ اس کے سینے میں جاگتا ہے، اس کے فرو ہو جانے کے بعد ماں کا ضدی بیٹا رو رو کر پھر ماں ہی کی گود میں گر پڑتا ہے۔ یہ شوخی اور غصّے کی یہ ڈرامہ بازی ــــ اس سے کیا بگڑتا ہے؟ کچھ نہیں بگڑتا! بلکہ بیٹا اپنے ماں باپ کو اور زیادہ پہچان لیتا ہے۔ وہ ماں باپ کا اور زیادہ پیارا بن جاتا ہے۔ بعید نہیں کہ اس طرح اسے ایک دن اچانک خدا بھی مل جائے۔ علاوہ ازیں اسے تو شوخی کرنے یا بغاوت کرنے کا حق ہی حاصل ہے۔ اس لئے کہ اس نے ماں کی ایسی گہری محبت حاصل کر لی ہے کہ اسے یقین ہے ــــ ماں اس کی ساری بغاوتیں اور تمام قصور ضرور معاف کر دے گی جس شفقت

محبت کی وجہ سے انسان کے دل میں شوخی جاگتی ہے یا غصہ
آتا ہے۔ کیا تجھے معلوم ہے کہ وہ شفقت و محبت کتنی گہری ہے۔"

نذرالاسلام کے کلام میں خدا کے خلاف جس بغاوت کا ظہور ہوا ہے، اس کی نوعیت کیا ہے۔ انہوں نے اپنی نظم چیر ندروہی (سد باغی) میں اپنی بغاوت کی یہی وجہ بتائی ہے۔ انہوں نے خدا سے خطاب کرتے ہوئے خود ہی بغاوت کی وجہ اس طرح پیش کی ۔

مجھے ایسے گہرے مارے باغی بنا دیا ہے
تیری دنیا میں دکھ درد کیوں ہے ؟
یہی چیز مجھے ہمیشہ ستاتی ہے ۔
تیری کائنات میں بے نظمی ہے ۔ اس لئے میرا دل روتا ہے
میرے گہرے نالے نے مجھے باغی بنا دیا ہے ۔

(سدا باغی آخری سوغات)

نذرالاسلام سید کی کے ساتھ خدا سے کیسے بغاوت کر سکتے تھے؟ وہ تو دنیا کے جابر حکمرانوں کے من مانے منتری نظام کو توڑ پھوڑ کر خدائی نظام کو روئے زمین پر نافذ کرنا چاہتے تھے ان کا خیال ہے کہ ۔۔۔ بنائے ہوئے قوانین ہر ملک، ہر دور اور ہر سماج کے لئے یکساں موزوں نہیں ہو سکتے ۔ ہاں خدائی نظام فطری نظام ہے ۔ وہ ہر معاشرہ ، ہر عہد اور ہر علاقے کے لیے مناسب ہے ۔ فطری اور خدائی نظام پر کسی کو چوں و چرا کرنے کا حق نہیں فرماتے ہیں ۔

تیرا انسانی نظام ، تباہ ہو جائے ۔
خدا کا نظام قائم ہو!
خدا کا نظام قائم ہو!
خدائی نظام میں تیرے تصرفات کو
دنیا کے لوگ اب نہیں مانیں گے ۔!
دنیا کے لوگ ہرگز نہیں مانیں گے !!

جتنے منہ اتنی باتیں ۔

تو کس کی حکومت مانے گا ؟

کتنے آدمیوں کی خاطر داری کر سکے گا ؟

تو ایک سماج کو مانے

تو دوسرا سماج تجھے جلا وطن کر دے گا

چاروں طرف زنجیریں ہیں

سوچو سکھوں کا مطمع نظر ہو سکتا ہے

اس کی دوستی سے ہی آنکھیں روشن کرے ۔

خدا کا نظام قائم ہو ۔

خدا کا نظام قائم ہو ۔

(ستیہ متر ستیہ پالتی)

قومی بیداری میں نذرالاسلام کا حصّہ

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تن نازک میں شاہیں کا جگر پیدا
(اقبال)

یہ تھی کسی خونریزی کے صدقے ہمیں پاکستان نہیں ملا۔ ہماری آزادی عوام کی ذہنی بیداری اور اعصابی جنگ ہی کا نتیجہ ہے۔ روسی انقلاب میں ٹالسٹائے اور فرانسیسی انقلاب میں روسو نے جو کام کیا ہے۔ سرزمین بنگال کی قومی بیداری میں نذرالاسلام کی شاعری نے وہی کام انجام دیا ان کی شاعری نے گھر گھر آزادی کا پیغام پہنچایا۔ مظلوم عوام میں خودارادیت اور خوداعتمادی کا جذبہ پیدا کیا۔ اور یہی جذبہ حصول پاکستان کا پیش خیمہ بنا۔ قوم آزاد ہوئی اور لوگوں نے انہیں قومی شاعر قرار دیا۔ نذرالاسلام نے جن الفاظ میں مظلوم عوام کو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے اور اپنے حقوق کو حاصل کرنے کی دعوت دی اس کے دو ایک نمونے ملاحظہ ہوں۔

جاگو ——— بھوک کے اسیر جاگو!
دنیا میں جتنے پامال اور بدقسمت ہو، جاگ اٹھو!
تمام ظلم و ستم کا خاتمہ کرنے کیلئے آج
مظلوم انسانیت کے دل میں آواز انقلاب گونج رہی ہے۔
وہ دیکھو! نئی زندگی جہانِ نو لیے آ رہی ہے۔

.

——— نوجوانو! ——— سرمایہ دارو!
ہم سب کچھ کھو چکے تھے۔ اب سب کا سب فتح کر لیں گے

نذرالاسلام علامہ اقبال کے بعد ہماری قومی بیداری کے مینوا ہیں۔ ہمیں یہ ... ان میں سے اسکے پس منظر میں کوئی نوجی ...

اے لوگو ! اس آخری جنگ میں آج تم سب
اپنے اپنے حقوق پر کھڑے ہو جاؤ ۔

(بین الاقوامی سنگیت' فی مسا)

نذرالاسلام نے اپنی شاعری میں قوم کے کسی طبقے کو نظر انداز نہیں کیا نوجوان، طلبا، کسان، مزدور، ماہی گیر، بیک، گنہگار، چور، ڈاکو، بھنگی، طوائف غرض سبھوں کے منہ میں زبان دی۔ سبھوں کے جذبات کی عکاسی کی ہر ایک کی نکبت و مسرت کے گیت گائے ۔ مزدوروں کو روشن مستقبل کا مژدہ سنایا ان میں آزادی کی اُمنگ اور حرکت و عمل کی حرارت پیدا کی ۔ فرقہ وارانہ تعصبات سے بالاتر ہو کر ہندوؤں اور مسلمانوں کو مساوات' برادری، ہمدردی اور میل محبت کے درس دئے ۔ ادیبوں اور شاعروں کو بھی اپنا ہمنوا بنایا ۔ ادب کو پوری قوم کے جذبات و احساسات کا آئینہ دار بنایا
نذرالاسلام نے نہ سیاست سے گریز کیا، نہ خود کو سیاست میں کھو دیا وہ فرقہ وارانہ سیاست سے بالاتر تھے انہوں نے ہر اس سیاسی جماعت کا ہاتھ بٹایا جو حصول آزادی کے لئے کوشش کر رہی تھی وہ قومی شاعر ہیں کسی خاص فرقہ یا مذہب کے شاعر نہیں اس لیے پوری قوم کی نیابت کرنا ہی ان کا کام تھا جس طرح انہوں نے تحریک ترک موالات اور تحریک خلافت میں اہم کردار ادا کیا ۔ اسی طرح مزدوروں اور کسانوں کی تحریک حتیٰ کہ دہشت پسندوں کی حمایت میں بھی کوئی کوتاہی نہیں کی ۔

نذر لاسلام بے پروا اور حق گو صحافی تھے ۔ انہوں نے ہر قیمت پر آزادی کی علم برداری کی ۔ صحافت میں مقبولیت حاصل کر لی ۔ سیاست کو صحافت سے اور صحافت کو سیاست سے کس قدر گہرا رشتہ ہے وہ ہر اہلِ علم کو معلوم ہے ۔ انہوں نے صحافت اور سیاست میں ہمیشہ غیر جا ۔ ۔ کا ثبوت دیا ہے ۔ روزنامہ نوخوگ کی ادارت سے تحریکِ خلافت اور تحریکِ ترکِ موالات کی حمایت کی ۔ دھوم کیتو کے ہنگامہ خیز اداریوں سے دہشت پسند تحریک کا بول بالا کیا ان کی سرکردگی میں لانگل شائع ہوا ۔ اس کے ذریعے پسرسوراج پارٹی نے فروغ پایا اگرچہ ان کی صحافت نگاری میں عام ۔ ۔ ۔ پر سیاسی لکھنوں کے تجربے نہیں ہوتے تھے اور سیاسی پالیسیوں میں گہری سوجھ بوجھ کا ثبوت نہیں ملتا

تھا، تاہم بلاشبہ یہ کہنا ہوگا کہ ان کی صحافت نگاری نے وقت کی سیاسی تحریکوں کو مقبول عام بنانے اور عوام کو سرگرم کار لانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ان کے اداریہ مضامین پڑھیں، تو ان کے سیاسی خیالات سے ہم اتفاق کریں یا نہ کریں لیکن ان کے خلوص کا سکہ ہمارے دلوں پر بیٹھ جاتا ہے اور ان کی سرفروشی کے آگے ہمارا سر ادب سے جھک جاتا ہے۔ ان کو حصولِ عزت یا اکتسابِ دولت سے کوئی غرض نہ تھی ان کی سیاست، ان کی صحافت سب کچھ قوم ہی کے لئے تھا۔

نذر الاسلام شباب کے شاعر تھے۔ وہ قوت و اقتدار سے اپنی منزلِ مقصود کو پہنچنے کے خواہشمند تھے۔ اسی لئے انہوں نے نوجوانوں کو ساتھ لے کر بڑھنا چاہا۔ ان کو معلوم تھا کہ نوجوانوں کا خون گرم ہوتا ہے۔ ان میں کام کرنے کی لگن اور زندگی کی مشکل گھاٹیاں طے کرنے کی قوت وصلاحیت موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے نوجوانوں سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ رکھیں اور انہیں میدانِ جہاد میں لا کر ایک جہانِ نو کی بنیاد ڈالنی چاہی۔ فرماتے ہیں۔

چلو چلو بڑھے چلو !
او پچھے آسمان پر طبلِ جنگ بج رہا ہے۔
روئے زمیں پر ہیجان طاری ہے۔
صبحِ رنگیں کے نوجوانو !
چلو ! چلو ! چلو !
چلو ! چلو ! بڑھے چلو

صبحِ کاذب کے دروازے پر ضرب لگا کر
ہم صبحِ رنگین وجود میں لائیں گے۔
شبِ تاریک کا خاتمہ کر دیں گے
رکاوٹ کا سد تھیا چل پہاڑ راہ سے ہٹا دیں گے
زندگی کے تارہ بتارہ گیتوں سے ،

گورستان کو حیاتِ نو بخشیں گے۔
اس میں نئی روح پھونکیں گے۔
اور اسے نئی قوتِ بازو عطا کریں گے۔

نوجوانو! بڑھے چلو
کان کھول کر سنو
موت کی محرابوں سے
زندگی کی پکاریں اٹھ رہی ہیں۔
توڑ دو دروازے کی کنڈی توڑ دو۔
چلو، چلو، چلو
چلو چلو بڑھے چلو

آسمان پر بجلیاں یہ حکم دے رہی ہیں۔
کہ اے عیدِ شہادت کے آرزو مند سپاہیو! لیس ہو جاؤ۔
چاروں طرف صف آرائیاں ہو رہی ہیں۔
خوابِ غفلت سے جاگ اٹھو۔
اے مسافرو! تم کب تک
اپنے عہدِ ماضی کی خیالی بادشاہت کے گیت
گا گا کر آنسو بہاتے رہو گے!

تختِ طاؤس کو جانے دو۔
جاگو غافلو جاگو!

دیکھو : کتنے ایران ، روم
یونان اور روس ڈوب گئے تھے
اب وہ سب خاک اٹھے ہیں ۔
اے کمزورو ! خاک اٹھو ۔
ہم لوگ از سرِ نو ریتا سے
تاج محل بنائیں گے ۔
چلو ۔ چلو ! بڑھے چلو ۔

(سندھیا)

نذر الاسلام درد و الم کے آغوش میں پل کر بڑے ہوئے ۔ انہیں زندگی بھر نشیب و فراز سے گذرنا پڑا ۔ بچپن ہی میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا ابتدائی عمر ہی میں انہیں خانگی ذمہ داریاں سنبھالنی پڑیں ۔ زندگی کی ہر منزل میں تنگ دستی کا مقابلہ کرنا پڑا ۔ یہ وہی قومی شاعر نذر الاسلام ہیں جن کو کسی ایک زمانے میں باورچی کی حیثیت سے کام کرنا پڑا ۔ نانبائی کی دوکان میں پانچ روپیہ ماہوار پر ملازمت کرنی پڑی ۔ ان کو عوام سے سابقہ پڑا اور عوام کے دکھ درد کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا موقع ملا ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دل میں عوام کیلئے والہانہ محبت تھی ۔ جب وہ جنگ سے تلخ تجربات لے کر واپس آئے ، تو یونہی ان کا دل درد سے بھرا تھا ۔ مزید برآں جب انہوں نے اپنے معاشرے میں قدم رکھا تو دیکھا کہ سرمایہ دار طبقہ غریبوں کا خون چوس رہا ہے اور وہ اُونچے اُونچے محلوں میں رہ کر پھولوں کی سیج پر سوتا ہے ۔ مگر دوسری طرف غریب ، مزدور اور کسان کا طبقہ دانے دانے کو ترس رہا ہے ۔ اسے تو جھونپڑیوں میں کھانے کیلئے ایک لوٹا تک میسر نہیں اندھیرے گھر کو روشن کرنے کے لئے ایک بتی تک فراہم کرنا مشکل ہے ۔ وہ ظلم و ستم کی آگ میں جل بھن کر خاک ہو رہا ہے ۔ جہالت و افلاس میں گھٹ رہا ہے مگر لب کھول کر کچھ کہنے کی مجال نہیں رکھتا ۔ ایسے حالات نذر الاسلام سے رہا نہ گیا ۔ انہوں نے درد بھرے دل سے ان کے جذبات و احساسات کی یوں تصویر کشی کی ہے :-

تو نے ہیرا اور موتی نہیں چاہا ۔
سات کروڑ روپے بھی نہیں مانگے ۔
تیری ضرورت تو صرف یہ ہے کہ
تجھے کھانے کو مٹھی بھر بھات مل جائے ۔
تو نے اپنی تھکن دور کرنے کیلئے ۔
ٹوٹی پھوٹی چٹائی پر سونا چاہا
تجھے صرف ایک جھونپڑے کی آرزو تھی ۔
جو چراغ سے روشن ہو۔
ان حالات میں تجھ پر تباہی آئی ، وبا اتری
نقب لگانے والے چور (ساہوکار) آئے ۔
(اور تیرا سب کچھ ہڑپ کر گئے ۔)

(سرب ہارا ، سرب ہارا)

طبقاتی اونچ نیچ نذر الاسلام کو ایک آنکھ نہیں بھاتی ۔ اس لئے وہ غریبوں کی زبان سے امراء و رؤسا کو ان الفاظ میں ہوشیار کر دیتے ہیں کہ

تو سہ منزلہ عمارت میں رہ کر مزہ لوٹتا رہے گا اور ہم خاک نشیں رہیں گے ۔
مزید براں ہم تجھے دیوتا مانیں گے ۔ تیری یہ توقع آج غلط ہے ۔

(قلی مزدور، سرب ہارا)

نذر الاسلام نے مزدوروں کی نہ صرف آنکھیں کھول دیں بلکہ انہیں اس بات کی بشارت بھی دی کہ ایک زمانہ آئے گا ۔ جب عنانِ حکومت ان کے ہاتھوں میں ہوگی اور ان کے سارے رنج و خاتمہ ہو جائے گا ۔

فرماتے ہیں ۔۔

جن کے تن من مٹی کی محبت آمیز تری سے نم ہیں ،

انہی کے قبضے میں رشتی جہاں کا پتوار ہو گا

آج مظلوم انسانیت کا عروج ہو رہا ہے۔
عالم بالا میں خدا مسکرا رہا ہے اور عالم زیریں میں شیطان ڈر سے کانپ رہا ہے
اقبال کو بھی مزدوروں اور مفلسوں کے روشن مستقبل کا یقین تھا۔ انہوں نے مزدوروں
کی کامیاب تحریک دیکھ کر مسرت بھرے جذبات کا یوں اظہار کیا۔

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
آسماں! ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

سلطانی جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

نذر الاسلام نے قوم میں عظمتِ محنت کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے
غریبوں اور مزدوروں میں یہ احساس پیدا کیا کہ ملک کی ترقی اور بہبودی ان کی محنت کے بغیر
ہرگز ممکن نہیں۔ ان کی عرق ریزی نہ ہو، تو ملک کا تہذیب و تمدن کبھی پنپ نہیں سکتا۔ اقتصادی
اور صنعتی ترقی نہیں ہو سکتی۔

فرماتے ہیں۔

سڑکوں پر تیری موٹریں چلتی ہیں، سمندروں میں تیرے جہاز چلتے ہیں۔
تیری محنت سے ریل کی پٹڑیوں پر ریل گاڑیاں چلتی ہیں، ملک کلوں سے بھر گیا ہے۔
اے سرمایہ دار بتا — یہ احسانات کس کے ہیں؟ تیری عمارت کس کے خون سے رنگین ہے؟
آنکھیں کھول کر دیکھ — ہر ایک اینٹ میں لکھا ہوا ہے۔
ان سڑکوں، جہازوں، ریل گاڑیوں اور عمارتوں کا راز
تجھے معلوم نہ ہو تو نہ ہو مگر راستے کے ہر ذرّے کو تو ضرور معلوم ہے۔

طالع مسعود آ رہا ہے ـــ

رفتہ رفتہ قرض بہت بڑھ گیا ہے ۔ قرض کو چکانا ہی ہوگا ۔

کسانوں کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے ۔ وہ ملک کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ معاشرے کے لئے غذا اور خام اشیاء مہیا کرتے ہیں ۔ ان کے بغیر سماج کا گذارہ ہی نہیں ہوسکتا نذر الاسلام نے دیکھا کہ معاشرے کا یہ اہم طبقہ زمینداروں کے شکنجے میں پڑکر تباہ ہو رہا ہے ۔ فصلیں تو کسان اگاتے ہیں مگر زمینداروں کا طبقہ انہیں اپنے جائز حقوق سے محروم رکھتا ہے ۔ انہیں معمولی حصہ دے کر باقی سب خود کھا جاتا ہے ۔ جو کسان زمین میں کھیتی باڑی کرتے ہیں ان کو اس پر مالکانہ حق نہیں دیا جاتا ۔ ان کی پیداوار کی بدولت زمیندار عیش وعشرت سے دن گذارتے ہیں مگر بیچارے کسانوں کو دو وقت کا کھانا بھی میسر نہیں ہوتا نذر الاسلام ایک رحمدل انسان ہیں کسانوں کی نازک حالت دیکھکر وہ تاب نہ لاسکے ۔ انہوں نے زمینداروں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا :-

عوام کا خون جونک کی طرح چوس لیتے ہیں، وہی مہاجن کہلاتے ہیں ۔
جو زمین کو اپنی اپنی اولاد کے برابر خیال کرتے ہوئے اس کی پرورش کرتے ہیں، انہیں
زمیندار نہیں کہا جاتا ہے ۔

زمین پر جن کے قدم نہیں پڑتے ۔
وہی زمین کے مالک بنتے ہیں ـــ
جو جس قدر ستار اور دغاباز ہیں ، وہ اسی قدر طاقتور ہیں ۔
ست نئی چھریاں بنا کر یہ قصاب علم و ہنر کا دم بھرتے ہیں ۔

(فریاد، سرب ہارا)

اقبال کو بھی کسانوں اور مزدوروں سے بے پناہ محبت تھی ۔ مظلوموں کا حق تلف ہوتے دیکھ کر وہ تاب نہ لاسکے ۔ چنانچہ انہوں نے کسانوں کو زمینداروں کے خلاف ابھارا اور زمینداروں کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ دراصل زمین پر کسی کا مالکانہ حق نہیں ہے ۔ زمین اللہ ہی کی ہے ۔ انسان کو

اس سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے ۔ فرماتے ہیں ۔

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو   (بانگ درا)

وہ خدایا ! یہ زمیں تیری نہیں ، تیری نہیں ،
تیرے آبا کی نہیں ، تیری نہیں ، میری نہیں
(الارض للہ ، بال جبریل)

آج زمینداری کا نظام منسوخ کر دیا گیا ہے اگر آج نذر الاسلام با ہوش و حواس ہوتے ، تو یہ زمانہ ان کو کتنی خوشی محسوس ہوتی ۔ ؛

نذر الاسلام سے پہلے بھی بنگلہ ادب میں کسانوں اور مزدوروں کی حق تلفی کا ذکر اور ان کے جذبات کی عکاسی کی گئی مگر نذر الاسلام کی طرح کسی شاعر نے ان کے سمجھ میں ایسی زوردار بغاوت پیدا نہیں کی جس سے زمینداروں ، مہاجنوں ، اور سرمایہ داروں کے دل دہل جائیں ۔ رابندرناتھ کی نظم "دو بیگھہ زمین" ہی کو لیجئے ــــــ اس میں مہاجن کے مظالم کا ذکر تو کیا گیا ہے مگر ان کے پیش کردہ کسانوں میں سینہ سپر ہو کر ظالم کو روکنے کا مجاہدانہ جذبہ نظر نہیں آتا ۔ نذر الاسلام بنگلہ ادب میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے صرف ظلم کا احساس ہی نہیں کیا ، بلکہ ان کی بیخ کنی کے لئے مظلوم طبقوں میں ایک اجتماعی قوت پیدا کرنے کی کوشش بھی کی ۔ ٹیگور کی طرح انہوں نے دو منزلہ یا سہ منزلہ عمارتوں میں رہ کر صفحۂ قرطاس پر صرف اپنے دل کی بھڑاس نکال کر بس نہیں کیا بلکہ عوام کے شانہ بشانہ کھڑے ہو کر ان کا ہاتھ بٹایا ۔ ان کے دکھ درد میں حصہ لیا اور ان میں جماعت بندی کا مادہ پیدا کرنے کی سعی کی ۔ فرماتے ہیں ۔

کسانو ! اب جاگ اٹھو ۔ سب کچھ تو کھو چکے ہو اب ڈر کس کا ہے ۔
اب ہم اس بھوک کی طاقت سے امرت کی دنیا قبضے میں لے لیں گے
اب اس عالمگیر ظالم بادشاہ کی شان کو سارے بدل دیں گے

اب قدرت دیکھے دنیا دیکھے کہ انسانوں میں کتنی طاقت ہے

(اگنی ساگر کا ان سمرینا)

نذر الاسلام نے معاشرے کے کسی طبقے کو نہیں چھوڑا۔ جہاں کہیں کوتاہی اور خرابی دیکھی وہاں بے خوف و خطر انگشت نمائی کی۔ انہوں نے کہا تھا۔۔

بھائی جہاں جھوٹ اور مکر کی ہو دھوم میں وہیں بغاوت کروں گا۔

معاشرے میں ملاؤں، مولویوں اور پروہتوں کو مذہبی معاملات میں مقتدا خیال کیا جاتا ہے۔ ان کی بے راہ روی پر نکتہ چینی کرنا آسان نہیں تھا۔ مگر نذر الاسلام نڈر تھے انہوں نے دیکھا کہ بعض مذہبی رہنما مذہب کی آڑ میں ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وہ مذہبی امور و رسوم ادا تو کرتے ہیں مگر ان کا دل خلوص و انسان ہمدردی سے خالی ہے یوں تو مذہب کا دم بھرتے ہیں مگر دولت کمانے کے چکر میں متوالے ہیں بے پناہ دولت کے مالک ہو کر بھی قوم و ملت کی ضرورت پر خرچ کرنا نہیں چاہتے۔ انہیں تو اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے چاہے دوسرے لوگ دانے دانے کو ترسیں۔

نذر الاسلام نے ایسے لوگوں کی تنگ نظری پر کاری ضرب لگائی۔ انہوں نے اپنی نظم مانوش میں قصے کے پیرائے میں مذہبی مقتداؤں کی تنگ نظری کی تصویر کھینچی کہ ایک روز پوجا کی تقریب میں مندر کے پروہت کے سامنے پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے سات روز کا ایک بھوکا بھکاری حاضر ہوا اور اس سے کچھ کھانا مانگا مگر سادھو پروہت نے منہ سے منہ موڑ لیا اور پورا مندر کا دروازہ بند کر لیا۔ علیٰ ہذا القیاس شاعر نے اسی نظم میں مسجد کے ایک امام کی تنگ نظری کی عکاسی یوں کی کہ ایک دفعہ مسجد میں کثیر تعداد میں نذر و نیاز کے کھانے پینے کے سامان کا ذخیرہ کیا گیا اتنے میں بوسیدہ لباس میں ملبوس سات دن کا ایک فقیر امام صاحب کے سامنے حاضر ہوا اور کچھ کھانے کا سوال کیا۔ اس پر امام صاحب اس سے پوچھنے لگے کہ تو نماز پڑھتا ہے یا نہیں؟ اس نے نفی میں جواب دیا تو امام صاحب سخت ناراض ہوئے اور وافر گوشت روٹی کو مسجد کے کمرے میں رکھ کر تالا بند کر دیا۔ ایسے مذہبی مقتداؤں کی تنگ نظری پر نذر الاسلام یوں چوٹ کرتے ہیں۔ -

جے سنگھ، محمود غزنوی اور کالا پہاڑ کہاں ہیں؟

اس عبادت خانے کے مقفل دروازے کو توڑ ڈالو۔

خدا کے گھر کا دروازہ کون بند کرتا ہے۔ کون اس پر تالا چڑھاتا ہے؟

اس کے تمام دروازے کھلے رہیں۔ اس پر ہتھوڑا اور کلہاڑی مارو۔

افسوس اے عبادت خانے!

تیرے معیار پر چڑھ کر دماغ اپنی مطلب برآری کر رہا ہے۔

ڈاکٹر اقبال بھی ایسے سنگدل اور انسانیت سے عاری مذہبی مقتداؤں سے سخت بیزار تھے۔ انہوں نے اپنی بیزاری کا ان الفاظ میں اظہار کیا ہے۔

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں

کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری (بال جبریل)

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے

پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو!

حق را بسجودے، صنماں را بطوافے!

بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو!

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے

میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو!

علماء کے باہمی اختلافات، مسلمانوں کی سطحیت اور روحانی قوت کے بحران کی تصویر مدرانِ اسلام نے یوں کھینچی۔

دنیا آگے بڑھتی جا رہی ہے اور ہم فقہ و حدیث میں گھرے۔

سلیمان کرلی کے زمانے میں کالا پہاڑ سپہ سالار تھے پہلے ہندو تھے بعد میں مشرف بہ اسلام ہو کر بہت سے مندر توڑ ڈالے

طلاق کے فتوے میں اُلجھے ہوئے ہیں۔

روحانی قوت کے اعتبار سے ہم جس قدر ردّ ہوتے جا رہے ہیں۔
اسی قدر تعداد میں ہم بھیڑوں اور بکریوں کی طرح بڑھتے جا رہے ہیں۔
(خالد: بجبر)

بعض تنگ نظر مذہبی رہنماؤں نے نذرالاسلام کی شاعری میں دیوتاؤں اور دیویوں کا ذکر دیکھ کر ان کے کفر کا فتویٰ دے دیا دوسری طرف ہندوؤں نے ان کے کلام میں عربی اور فارسی الفاظ کا وسیع استعمال دیکھ کر ان پر طعن کیا تو انہوں نے طنز و مزاح کے پیرائے میں اعتراض کرنے والوں کی تردیدیوں کی۔

حریص مولوی اور ملّا ہاتھ ہلا کر کہتے ہیں ـــــ
یہ دیوتاؤں اور دیویوں کے نام زبان پر لاتا ہے۔ تم سب اس پاجی کو اپنے
مذہب سے خارج کر دو
ہم نے فتویٰ دے دیا ہے ـــــ وہ قاضی (نذرل) کافر ہو گیا ہے
اگرچہ وہ شہید ہونے پر بھی تیار ہے۔
ہم پارہ عم کے پڑھنے والے ہیں مگر ہیچوں من دیگرے نیست کا دم بھرتے ہیں۔
اور اب تک مارے مارے پھر کر مفت کی کھا رہے ہیں۔
ہندو خیال کرتے ہیں ـــــ یہ کم ذات مسلمان ہے فارسی نما زبان میں شاعری کرتا ہے۔
(آمار کیفیت: سرب ہارا)

نذرالاسلام ہندوؤں کی چھوت چھات سے متنفر تھے اور اسے مذہبی عصبیت اور تنگ نظری پر محمول کرتے تھے اسی لئے وہ ہندوؤں پر اس طرح چوٹ کرتے ہیں۔

تو ذات کے نام پر بد ذاتی کا جوا کھیل رہا ہے۔
کیا چھو جانے ہی سے تیری ذات تباہ ہو جائے گی؟ ذات کوئی بچوں کا لڈو ہے؟

حقے کے پانی اور کھانے کی پابندی ہی کو تو نے اپنے مذہب کی روح سمجھ رکھا ہے۔
بے وقوف! اسی لیے تو نے ایک ہی دین کو سو طبقوں میں بانٹ دیا ہے
(خواتر دزداتی استیر باستی)

طلبا کا طبقہ معاشرے میں سب سے زیادہ آزادی پسند ہے۔ ان میں کام کرنے کی دھن اور قربانی کا جذبہ بوڑھوں کی نسبت زیادہ ہوتا ہے۔ وہ بے تاب ہوتے ہیں اور تبدیلی کی امنگیں ان کے دل میں موجزن ہوتی ہیں۔ نذرالاسلام تبدیلی کے نقیب تھے۔ انہوں نے تمام نوجوانوں خاص کر طالب علموں سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ کیں۔ اسی لیے انہوں نے طلبا کے بھی گیت گائے اور عام نوجوانوں کے بھی۔ انہوں نے ایسے لوگوں کو ساتھ لے کر ایک نئے مستقبل کی تعمیر کرنا چاہی۔ وہ تبدیلی کے گیت یوں گاتے ہیں۔

ہر دور میں مغروروں نے حکومت کی ہے۔
اس نے بربری کی حکومت نہ کبھی مانی ہے نہ اب مانے گا۔
ہم جہانِ نو کی تخلیق کریں گے۔ نئے گیت گائیں گے۔
یہ دنیا ادب و احترام سے اکھی بھر کر ہمارا عطیہ قبول کرے گی۔
ہر زمانے میں ہم جیسے نوجوانوں نے مکر و ریا اور بربریت کو دفن کیا ہے۔
انہیں گالی دینے دو۔ ہم مسکراتے ہوئے گاتے رہیں گے۔
انا للہ و انا الیہ راجعون

(جوش کی ترنگ، سندھیا)

طلبا کے گیت یوں گاتے ہیں۔

ہم مجسمۂ قوت ہیں ہم قدرت کی تمنائیں ہیں۔
ہم طاقت کی علامت ہیں
ہمارے پاؤں کے تلے عرش پیدا ہوتا ہے۔
یہ شمس و قمر اور تارے ہمارے تابع ہیں۔

ہم طلبا کی جماعت ہیں۔

ہم اندھیری رات کو پُرخطر راہوں میں
برہنہ پا چلتے ہیں۔
ہم تیر رفتاری کے زخم کھا کر سخت مٹی کو بھی،
خون آلود کر دیتے ہیں۔
ہر دور میں ہمارے خون سے
روئے زمیں تر ہوا ہے۔
ہم طلبا کی جماعت ہیں۔

نذرالاسلام کی شاعری میں جرأت و رجائیت

قل الحق ولو کان مُرًّا ۔ — حق بات کہہ دے اگرچہ کڑوی ہو۔ (الحدیث)

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا (اقبال)

”میں ایسے سر کسی کے سامنے نہیں جھکاتا ہوں“ (نذرل)

نذرالاسلام سے پہلے بنگلہ ادب میں کہیں ایسی جرأت و شجاعت نظر نہیں آتی جیسی کہ ان کی نظم ودروہی، دھوم کیتو، پرلے اُلاس، جگاستر برگان، شکل برا بگاں وغیرہ میں ملتی ہے یوں تو سرزمین بنگال کی فطرت ہی کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ یہاں کے لوگوں کی سرشت میں نیازمندی اور خاکساری کا مادہ زیادہ پایا جاتا ہے۔ یہاں کی شاعری میں شجاعانہ جوش اور مجاہدانہ جذبہ کی کمی ہر دور میں محسوس ہوئی ہے۔ مدھوسودن، ہیم چندر اور رابندر ناتھ کی شاعری میں اگر کہیں کہیں جوش و جذبے کے اکا دکا نمونے مل بھی جاتے ہیں، تو تھوڑی دور جا کر ان کی ولولہ انگیز لب و لہجہ مدھم ہو جاتا ہے اور وہ پھر نیازمندانہ سروں میں پناہ لیتے ہیں۔ مگر نذرالاسلام ایک انتھک بہادر اور جوش و جرأت کے علمبردار ہیں ان کا جوش و ولولہ ایک طوفانی کیفیت لئے ہوئے ہوتا ہے جو کسی رکاوٹ سے نہیں رکتا۔ ان کو نہ حکومت کی سزا کا ڈر تھا، نہ رسم و رواج کی پابندیوں کی پروا۔ قید بامشقت بھی ان کی زبان بند نہ کر سکی۔ ان کی نظموں میں ایسی روانی اور ہیجانی کیفیت ہے کہ اگر زبان کی کہیں دو ایک معمولی خامیاں اور شاعرانہ تکنیک کی بعض کوتاہیاں بھی ہوں، تو عبارت کی روانی اور اوزان و بحور کی جھنکاروں میں پوشیدہ ہو جاتی ہیں۔ ان کی کتاب اگنی بینا، بیشیر بانشی، رکیر، بھانگار گان وغیرہ کے ورق ورق میں اس کے سینکڑوں عمدہ نمونے نظر آتے ہیں۔

نذرالاسلام نے اپنی آتش نوائی اور شعلہ بیانی سے بنگلہ زبان و ادب میں ایک نیا رجحان

پیدا کیا۔ ان کے مزاج میں نرمی کے بجائے گرمی پیدا کی۔ اس سے پہلے کسی کو یقین نہیں آسکتا تھا کہ ایک بنگالی شاعر کا قلم ایسا تیر ایسا شعلہ بار ہو سکتا تھا۔ کامریڈ مظفر احمد اپنی سرگزشت میں نذر الاسلام کے زبان و بیان کے متعلق لکھتے ہیں۔

> ادب کے متعلق نقد و تبصرہ سے قطع نظر میں یہ کہوں گا کہ ہماری بنگلہ زبان ہمیشہ نذر الاسلام کی مرہون منت رہے گی ہماری زبان شیریں ہے۔ ہماری زبان نرم و نازک ہے۔ ہمیں یہ خیال تھا کہ ہماری زبان میں بہترین غنائی شاعری کی جا سکتی ہے۔ اور بس۔ ہمارے اس خیال نے جڑ پکڑ لی تھی کہ اس زبان میں زور نہیں مجاہدانہ جوش و جذبہ نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ہمارے سیاسی نعرے ہندوستانی زبان ہی میں ہوتے تھے۔ نذر الاسلام کے طلوع ہونے کے بعد ہمیں یہ اندازہ ہو گیا کہ بنگلہ زبان بھی زور دار ہے۔ مجاہدانہ جوش و جذبہ اور بے حد توانائی لئے ہوئے ہے
>
> ان کے بعد بھی بہت سے شعراء میدان میں اترے اور مجاہدانہ انداز میں شاعری بھی کی ہے، مگر ہم یہ کبھی فراموش نہیں کر سکتے ہیں کہ نذر الاسلام ہی نے اس راستہ کو ہموار کیا تھا۔"

بنگال کے ملائم اور نازپرور آب و ہوا شعراء و ادباء کے جذبات کو منکسرانہ اور نیازمندانہ بنا دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کی غنائی شاعری اپنی نوع کی بہترین چیز ہوتی ہے۔ مگر نذر الاسلام پر اس قنوطی ماحول کا کوئی اثر نہ پڑا۔ وہ ایک غیر معمولی شخصیت کے مالک اور فنکار مجاہد تھے، فطری طور پر دلیر اور رجائی واقع ہوئے تھے بچپن ہی سے مکروہات و علائق میں ان کی پرورش ہوئی فطرت نے انہیں ٹھونک بجا کر دیکھا۔ اسی لئے وہ جھجک اور ہراس سے بالاتر ہو گئے تھے۔ تلخ تجربات سے ان کے دل میں آتشیں کیفیت پیدا ہو گئی تھی ان کو یہ خود اعتمادی حاصل تھی

کہ وہ جو کچھ سمجھتے ہیں، برحق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری پر یاس وحرمان کی چھینٹ نہ پڑی۔ ان کا کلام پڑھنے سے قارئین کے دل میں امیدیں جاگتی ہیں۔ حق کے قیام اور باطل کی سرکوبی کے جذبات ابھرتے ہیں۔

بدر الاسلام ظالموں کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ مظلوموں کو فتح و نصرت کا مژدہ سناتے جاتے ہیں۔ ان کی کتاب "اگنی میا"، "سرب ہارا"، "زنجیر"، "بھاگنگارگان"، وغیرہ ہمت و استقلال، جرأت و شجاعت، خوداعتمادی و خودداری کی جذبات سے معمور ہیں۔ ان کے یہاں قنوطیت کیلئے کوئی گنجائش نہیں۔ وہ جہنم کی آگ میں جل کر بھی پھول کی طرح مسکرائے جاتے ہیں۔ سکھ ہو یا دکھ ہر وقت ان کے لبوں پر تبسم کھیلتا تھا جب تک ان کے ہوش و حواس درست تھے، وہ خلیق اور ملنسار آدمی تھے۔ خوشی کے موقع پر وہ دوستوں میں ایسا قہقہہ لگاتے تھے کہ آس پاس کے لوگوں کو بھی ان کی موجودگی کی اطلاع ہو جاتی تھی۔ ان کی فطرت کا جو حال تھا، ان کی شاعری کا بھی وہی مزاج تھا۔ جیسا کہ خود انہوں نے کہا ہے :۔

میں جہنم کی آگ میں بیٹھ کر بھی پھول کی ہنسی ہنستا ہوں۔

(بدروہی)

آج تخلیق کی خوشی میں ـــــ

میرا چہرہ ہنستا ہوا، میری آنکھیں ہنستی ہیں اور میرا پھڑکتا ہوا خون ہنستا ہے۔

(دولن چاپنیا)

اسی جرأت مندی اور حق پرستی کی بنا پر ان کی کئی کتابیں حکومت نے ضبط کرلیں۔ ان کا اخبار دھوم کیتو بند کر دیا گیا۔ خود انہیں قید بھگتنی پڑی۔ وہ سرکار کے بدترین دشمن قرار پائے۔ پھر بھی کبھی باطل کے آگے سر نہیں جھکایا۔ حکومت کے خلاف بغاوت کے الزام میں ان پر مقدمہ چلایا گیا اور انہیں گرفتار کرکے عدالت میں حاضر کیا گیا۔ وہاں بھی وہ اپنی حق پرستی پر اٹل رہے۔ حاکم کے سامنے انہوں نے جو بیان دیا، وہ ایسا جرأت مندانہ اور حقیقت پسندانہ تھا کہ اس کی نظیر بہت ہی کم ملتی ہے۔ اس بیان کا ایک اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

"مجھے زبردست خود اعتمادی حاصل ہے میں نے ناانصافی کو ناانصافی ہی کہا، ظلم کو ظلم ہی کہا۔ جھوٹ کو جھوٹ ہی قرار دیا۔ کسی کی خوشامد نہیں کی۔ کسی کی مداحی کی پرواہ نہیں کی محلوں کی ہوس میں کسی کا اتباع نہیں کیا میں نے صرف حکومت کی ناانصافیوں کے خلاف ہی بغاوت نہیں کی بلکہ میری صداقت شعار قلم نے معاشرہ، قوم اور ملک کے غلط طور طریقوں کے خلاف بھی برابر جہاد کیا ہے۔"

حق پرستی اور صداقت شعاری ان کا مذہب تھا۔ ظلم وستم کی بیخ کنی اور یک پیرامس اس شرے کا قیام ہی ان کا فلسفۂ زندگی تھا۔ خودی اور معرفتِ نفس ان کے اس فلسفہ کا سرچشمہ تھے وہ خودی کو رازِ درونِ حیات اور بیداریٔ کائنات کا ذریعہ خیال کرتے تھے۔ انہوں نے یہ کہا۔ عرفانِ نفس ہی کا نام خدا ہے۔ اس لئے کہ انسان کی خودی بیدار ہو، تو خدا بھی اس پر بھی ہو جاتا ہے نذرالاسلام کے الفاظ ملاحظہ ہوں :۔

اپنے میں آزاد اور اسلاف کی روح بیدار کرو
خودی بیدار رہو تو خدا بھی اسے چاہنے لگتا ہے
خدا کون ہے ؟ —
معرفتِ نفس ہے ۔ (اتمو شکتی بیتیر بانشی)

اقبال نے بھی اس سلسلہ میں کہا ہے ۔

ع تعمیر خودی میں ہے خدائی

اس خودی کے زورِ قوت سے نذرالاسلام خود بھی اپنی منزلِ مقصود تک پہنچایا جا سکتے تھے اور دوسروں کو بھی اس جذبہ سے سرشار ہونے کی ترغیب دیتے تھے۔ فرماتے ہیں :۔

بہادر کہہ دے
کہہ دے — میں سر بلند ہوں — (مدروہی)
تو خودی کو پہچان کہہ دے ۔ "میں ہوں"، "میری فتح یقینی ہے"

نذرالاسلام پہلے مسلم ادیب اور شاعر ہیں، جنہیں ملک کی آزادی کے لئے اسیر ہونا پڑا

اور اسیری میں بھی ان کا قلم آتش بار رہا۔ انہوں نے وہاں بھی حکومت کی بے جا کارروائیوں کے خلاف احتجاج کیا۔ زنجیر توڑنے کے گیت گائے۔
چالیس دن تک مسلسل بھوک ہڑتال کر کے اپنی شکایتوں کا مظاہرہ کیا۔ اپنی باغیانہ اور طنزیہ نظموں سے حکام کو عاجز کر کے چھوڑا:

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی (اقبال)

یہ درست ہے کہ قومی بیداری اور بنی نوع انسان کی نجات کی آواز نذر الاسلام سے پہلے بھی بنگلہ شاعری میں بلند ہوئی تھی۔ رئیس الشعراء رابندر ناتھ کو بھی اپنے وطن سے پُرخلوص محبت تھی انہوں نے بھی قوم کو خوابِ غفلت سے جگانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر ان کی آواز میں وہ تندی اور تیزی نہیں تھی، جو نذرل کے یہاں ملتی ہے۔ انہوں نے ڈنکے کی چوٹ پر انقلاب کی آواز بلند نہیں کی۔ انہوں نے پریم، ہمدردی اور درگذر سے عقدہ کشائی کرنا چاہی وہ عالمی اتحاد اور ہمہ گیر مصالحتوں سے دنیا کو وحدت کا نمونہ بنانا چاہتے تھے۔ دشمن کو محبت اور نیکی سے اپنانے کے قائل تھے اس میں شک نہیں کہ ان کی شاعری نے تعلیم یافتہ سماج کو بہت متاثر کیا، مگر عوام پر ان کی شاعری کا خاطر خواہ اثر نہ ہوا ان کے فلسفیانہ عمیق نکات عام لوگوں کی سمجھ کے باہر رہے۔ ان کی شاعری میں ظلم وستم کے خلاف انقلابی نعرے اور ظالموں سے انتقام لینے کا جذبہ نظر نہیں آتا۔ انہیں اپنی شاعری کی حسبِ توقع قدر نہ ہونے کی وجہ سے کبھی کبھی ایک گونہ مایوسی بھی ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں

اگر تیرا بلاوا سن کر کوئی نہ آئے تو تو تنہا چل

بنی نوع انسان کے ہمدرد شاعر چنڈی داس کے عہد سے لیکر ملک الشعراء رابندر ناتھ کے زمانہ تک سرزمینِ بنگال میں "وشنو سنگیت" کا کافی چرچا رہا۔ اسی کے اثر سے ہندو اور مسلمان اصحابِ قلم میں شجاعانہ جوش و جذبہ پیدا نہ ہو سکا "وشنو سنگیت" کے نیازمندانہ مزاج کی وجہ سے بنگلہ شعراء کے یہاں جواں مردانہ لب ولہجہ کا فقدان ہمیشہ نظر آیا رابندر ناتھ ٹیگور میں بھی انکساری

اور خود سپاری کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ وہ خدا کے سامنے جھک جاتے ہیں اور خدا کے سامنے اپنی ہستی کو مٹا دینے میں اپنی تکمیل سمجھتے ہیں۔ وہ خدا سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں:۔

اے خدا! تو اپنے قدموں پر میرا سر جھکا دے؛
میری تمام برائیوں کو آنسو میں ڈبو دے؛

مگر نذرالاسلام کہتے ہیں :۔

بہادر کہہ دے ــــ میں سر بلند ہوں۔
میرے سر کو دیکھکر کوہ ہمالیہ کی چوٹی بھی سرنگوں ہو جاتی ہے۔

نذرالاسلام کی شاعری میں ہر طرح کی بدعنوانیوں کے خلاف ایک گھن گرج نظر آتی ہے وہ ظلم سہنے اور دشمن کے سامنے کمزوری دکھانے کو گناہ سمجھتے ہیں اس لئے وہ دشمن سے مصالحت کرنے کے قائل نہیں۔ وہ دشمن کو قوت اور اقتدار سے قابو میں لینا چاہتے ہیں۔ ان کی شاعری میں پیچیدہ فلسفیانہ رموز و نکات نہیں ہیں جن کی وجہ سے عام پڑھنے والوں کو ان کے کلام کو سمجھنے میں کوئی دقت محسوس ہو۔ وہ عوام کو عام فہم زبان میں اپنے دل کی باتیں سناتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ عوام میں اتنے ہر دلعزیز ہیں۔ وہ حب الوطنی کے دائرے میں رہ کر عالمی محبت سے اپنا رشتہ جوڑنا چاہتے ہیں۔

نذرالاسلام عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے کے قائل نہیں۔ وہ زندگی کو ایک زندہ حقیقت سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مقصد آفرینی، تسخیرِ فطرت اور نت نئی تخلیق ہی میں زندگی کا راز مضمر ہے۔ وہ اپنی نظم "آمی گائی تاری گان" اور "جیون سندنا" میں ایسے عہد آفریں لوگوں کی تعریف کرتے ہیں، جن کی قوتِ شباب اور محنت و مشقت کے سامنے دنیا کی تمام رکاوٹیں شکست کھا جاتی ہیں زندگی کے تمام امکانات بروئے کار آجاتے ہیں اور جن کے جوش کردار و حرارت فکر و عمل سے دنیا جنت کا نمونہ بن جاتی ہے۔ فرماتے ہیں :۔

میں اس شباب کے گیت گاتا ہوں ــــ
جو زندگی کے ممکنات کو بروئے کار لانے کے لئے ہاتھ میں تیغِ براں لئے ہوئے ہے،

جو جوانمردی اور برق رفتاری کے ساتھ دنیا کے گوشہ گوشہ میں نکل پڑا ہے۔
(آمی گائی تا ہی گان چکرباک)

میں انہیں کے گیت گاتا ہوں ــــــ
جنہوں نے دنیا کے ہاتھ میں آج کی فصل کا فرمان بھیجا دیا ہے۔
جن کی جفاکشی اور سخت مٹھیوں کے آگے
سبھی دولت زمین خوان بھر کر پھل پھول کا نذرانہ پیش کر دیتی ہے۔
(جیون بندنا، چکرباک)

اقبال بھی شباب اور زندگی کے شاعر ہیں انہوں نے جوانوں کو مخاطب کر کے شباب اور زندگی کی ترجمانی یوں کی ہے

نہیں ترا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر
راز حیات پوچھ لے خضر خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوشش نا تمام سے
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی
ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں

اقبال کی طرح نذر الاسلام بھی انسانی زندگی کے بے انتہا امکانات پر یقین رکھتے ہیں وہ ہمیں نئے نئے انکشافات اور سائنسی ایجادات کی ترغیب دیتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ قدرت نے انسان میں بے پناہ قوتیں ودیعت کی ہیں۔ انسان کو چاہیئے کہ بلند ہمتی سے کام لے کر آسمان زمین میں نیز اس سے آگے جو چیزیں اب تک غیر منکشف ہیں، ان کا بھی انکشاف کرے اور بڑے بڑے کارنامے انجام دینے کیلئے ہمیشہ قربانی دینے پر تیار رہے۔ وہ ایسے لوگوں کی تعریف کرتے

ہیں جو شباب اور اولوالعزمی کے علمبردار ہیں۔ فرماتے ہیں :۔

میں انھیں لوگوں کی تعریف کرتا ہوں ـــــ

جو نئی دنیا کی تلاش میں قطبوں کی مہم پر روانہ ہوتے ہیں ،

پر لگاکر آسمان کی طرف پرواز کرتے ہیں۔

پھر بھی ان کے شباب کا جذبہ نہیں کہتا۔ وہ زندگی کی جوستی میں

چاند اور مریخ کے سیاروں اور لامتناہی آسمانوں پر جانا چاہتے ہیں

جو زندگی کے خواب لیے کر موت کے دروازے پر پھیری کرتے ہیں۔

اور پُرخطر لڑائیوں میں جان کی بازی لگاتے ہیں

(حیون۔ سپندنا۔ چکرپاک)

نذرالاسلام شکست و تباہی کو دیکھکر نہیں گھبراتے بلکہ اس میں انہیں حسن اور روشن مستقبل نظر آتا ہے۔ ان کو معلوم ہے کہ جس درجہ دردِزہ ولادت کی خبر دیتا ہے اسی طرح تخریب بھی تعمیر کا پیغام لاتی ہے طوفان تباہی بدوش آتا ہے مگر اس کے اثر سے زمین بھی زرخیز ہو جاتی ہے۔ اسی لئے وہ پُرامید نگاہوں سے اس کا انتظار اور خیرمقدم کرتے ہیں۔ انقلاب سے موجودہ سیاسی اور سماجی نظام کو تہ وبالا کرکے نئے سرے سے ایک معتدل ضابطۂ حیات قائم کرنا چاہتے ہیں اور لوگوں کو فتح و نصرت کے گیت گانے پر اکساتے ہیں

تباہی کو دیکھکر تو کیوں ڈرتا ہے ؟ تباہی کا درد نئی تخلیق کا پیغام دیتا ہے۔

تباہ شدہ زندگی کے بدنما داغ کو مٹانے کے لئے دورِ جدید آرہا ہے۔

اسی لئے بیساکھ کا وہ طوفان اپنے ڈراؤنے بھیس میں

تباہی لئے بھی مسکراتا آرہا ہے۔

وہ توڑ کر بھی دائمی حسن کی تعمیر کرنا جانتا ہے۔

تم سب فتح کے نعرے لگاؤ !

تم سب فتح کے نعرے لگاؤ ! (پرلئے الاس اگنی بینا)

نذرالاسلام اور انسانیت

انسان سے بڑا کچھ نہیں اس سے معزز تر کچھ نہیں نذرالاسلام

انسان ایک بالاترین حقیقت ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی حقیقت نہیں ۔۔ چنڈی داس

آدمیت احترام آدمی ؛ باخبر شو از مقام آدمی اقبال

اشراف اور کمینے سے لے شاہ تا وزیر ہیں آدمی ہی صاحب عزت بھی اور حقیر

یاں آدمی مرید ہیں اور آدمی ہی پیر اچھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے لے نظیر

اور سب میں جو بُرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

(نظیر اکبرآبادی)

بنگلہ شاعر چنڈی داس اور اردو شاعر نظیر اکبرآبادی کی طرح نذرالاسلام نے بھی انسانیت کا جھنڈا بلند کیا۔ ان کے دل میں انسانیت کا بڑا ادب و احترام تھا۔ انہوں نے اپنی نظم سمو بادی اور مانوش میں اس حقیقت کا کھلم کھلا اظہار کیا ہے کہ دنیا کا ہر انسان خواہ وہ ہندو یا مسلمان عیسائی ہو یا یہودی سب بحیثیت انسان برابر ہیں۔ گوتم بدھ کو اپنے دھیان میں یہی حقیقت ملی تھی اور رسول عربی (صلعم) پر جو وحی نازل ہوئی تھی، اس کا خلاصہ بھی یہی تھا۔ نذرالاسلام کسی خاص مذہب کے شاعر نہیں بلکہ عین انسانیت کے شاعر ہیں۔ بنی نوع انسان کی نجات کے شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری میں ہر مذہب کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ اور کہا کہ دنیا کے سارے لوگوں میں آدمیت قدر مشترک ہے۔ یہاں تک پہنچ کر اسلام، ہندوئیت، نصرانیت اور یہودیت کے ڈانڈے مل جاتے ہیں۔ انسان کا دل بہترین صحیفہ ہے۔ انسان کو چاہئے کہ اپنے دل کا مطالعہ کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ آدمیت کا احترام تمام مذاہب کی روح ہے تمام مذہبی کتابوں کے ورود اور نبیوں کی بعثت کا یہی مقصد تھا۔ فرماتے ہیں :۔

ہم مساوات کے گیت گاتے ہیں ۔

جہاں پہنچ کر تمام رکاوٹیں اور تفرقے مٹ جاتے ہیں۔
جہاں پہنچ کر بودھ، مسلمان اور عیسائی سب ایک ہو جاتے ہیں۔
ہم مساوات کے گیت گاتے ہیں۔
تجھ میں تمام کتابیں اور ہر زمانے کا علم موجود ہے۔
اے دوست! اپنا دل کھول کر دیکھ لے اس میں تجھے تمام مذہبی کتابیں نظر آئیں گی۔
اسی دل دھیان کے غار میں گوتم بودھ نے مظلوم انسانیت
کی لیکارسنی اور اس کی نجات کیلئے اپنی حکومت تک ٹھکرا دی تھی۔
اس دل کے غار میں رسول عربی صلعم پیغام الہٰی سنتے تھے۔
یہیں بیٹھ کر انہوں نے قرآنی مساوات کے گیت گائے۔
بھائی ہم نے غلط نہیں سنا ـــــ
ان کا فرمان ہے ـــــ اس دل سے بڑھ کر کوئی مندر یا کعبہ نہیں۔
(تمو بادی، سرب ہارا)

انسان سے بڑا کچھ نہیں۔ اس سے معزز تر کچھ نہیں
ملک، دور، رنگ، نسل اور مذہب کا کوئی امتیاز نہیں۔
ہر ملک، ہر دور اور ہر نسل کے جمیع انسان ایک ہی رشتۂ انسانیت میں منسلک ہیں۔
(مالوستی، سرب ہارا)

اسلام ایک ایسا معاشرہ ہے جو نسل، رنگ اور زبان اور جغرافیائی حد بندیوں کو توڑ کر روئے زمین کے تمام خطوں میں پھیل سکتا ہے اور اس بنیاد پر انسانوں کی ایک عالمگیر برادری قائم ہو سکتی ہے۔ رسول کریمؐ نے فرمایا۔

"وَكُونُوا عِبَادَ اللهِ إِخْوَانًا"

"اللہ کے بندے بن کر اور بھائی بھائی ہو کر رہو۔"

دوسری حدیث میں ارشاد ہے

اَلْخَلْقُ عِیَالُ اللّٰہِ مَنْ کَانَ فِیْ عَوْنِ اَخِیْہِ کَانَ اللّٰہُ فِیْ عَوْنِہٖ -

سب لوگ اللہ کے عیال ہیں۔ جو اپنے بھائی کی مدد کرتا ہے، اللہ بھی اس کی مدد کرتا ہے

رسول کریمؐ نے یہ بھی فرمایا -

خَیْرُ النَّاسِ مَنْ یَّنْفَعُ النَّاسَ

بہترین آدمی وہ ہے جو لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے

نذرالاسلام وسیع القلب انسان ہیں - وہ اسلام کے ہمہ گیر نظریہ اسلام کے قائل ہیں وہ
ہر انسان کو اپنا بھائی سمجھتے ہیں۔ مظلوم انسانیت سے ان کو سچی ہمدردی ہے وہ افراد ملت کے احترام
کو نوع انسان کا احترام اور ایک کسی فرد کی ذلت کو پوری انسانیت کی ذلت خیال کرتے ہیں فرماتے ہیں

ہر دور اور ہر ملک کے لوگو! آؤ — تم ایک ہی سنگم میں
کھڑے ہو کر اتحاد کا ترانہ سنو!
ایک آدمی کو دکھ پہنچے -
تو سب کے سینوں میں وہ مساوی طور پر پہنچتا ہے -
ایک آدمی کی ذلت
بنی نوع انسان کی ذلت ہے — سبھوں کی بے عزتی ہے!

شیخ سعدیؒ نے اس حقیقت کو گلستاں میں یوں بیان کیا ہے -

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند
کہ در آفرینش ز یک جوہر اند
چو عضوے بدرد آورد روزگار
دگر عضوہا را نماند قرار

۱۹۳۵ء میں مانک گنج (ڈھاکہ) کے ایک جلسہ میں حیدر یال نے نذرالاسلام کے
ادب کے متعلق کہا

" ان کی شاعری سے آشنا ہو کر مجھے یہ معلوم ہوا کہ ان کی شاعری معمولی شاعر نہیں۔ یہ شاعری مٹی کی بو باس رکھتی ہے۔ ہمارے متقدمین شعراء دو منزلہ عمارتوں میں بیٹھ کر شاعری کرتے تھے۔ رابندر ناتھ دو منزلہ سے نہیں اترے کیچڑ اور کھیتوں پر قدم رکھنے سے صرف وہی نہیں، دوارکا ناتھ بھی احتراز کرتے تھے۔ معلوم نہیں نذرالاسلام کہاں پیدا ہوئے مگر ان کی شاعری میں دیہات کا لب ولہجہ اور مٹی کی بو باس پاتا ہوں ملک میں خیال کی خوصورت کا۔ دیا ہے وہی ان کا شعر ہے جس میں پالش زیادہ نہیں ہے ہل اور کسان کے گائے ہیں

(معدرل جیرت مالس)

نذرالاسلام آفاقی اور عالمگیر شاعر ہیں اس لئے کہ انھوں نے آفاقی اور عالمگیر جذبات کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے انسانی جذبات اتنے ہی وسیع ہیں جتنی کہ کائنات انھوں نے مظلوم انسانیت کے دکھ درد کو دل سے محسوس کیا۔ آپ بیتی میں جگ بیتی اور جگ بیتی میں آپ بیتی پیدا کی۔ ان کی شاعری میں مظلوم انسانیت کے لئے جس قدر خلوص اور دلی ہمدردی کی ترجمانی ملتی ہے۔ وہ بنگلہ ادب کے کسی اور شاعر کے یہاں نظر نہیں آتی اس لحاظ سے نذرالاسلام کے ادب کو آفاقی ادب کی سطح سے نیچے نہیں لایا جا سکتا۔

نذرالاسلام سے پہلے ہی بنگلہ ادب میں انسانیت پر بہت کچھ لکھا جا چکا تھا مگر وہ ادب بالا نشینوں اور نام نہاد مہذب انسانوں کے جذبات واحساسات کا آئینہ دار تھا۔ ادب میں عامۃ الناس خاص کر ادنیٰ درجے کے انسانوں کو لائق اعتبار نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ہمدردانہ جذبات کے ساتھ پس ماندہ لوگوں کے خیالات واحساسات کی ترجمانی نہیں کی جاتی تھی۔ بدکار، گنہگار اور کمتریں لوگوں کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ نذرالاسلام پہلے شاعر ہیں، جنہوں نے کھلے الفاظ میں مساوات کے گیت گائے۔ چور، ڈاکو، بھنگی، زناکار غرض معاشرے کے ہر قابل نفریں انسان سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ دولت مند، مفلس، بڑے چھوٹے سب کو اولاد آدم قرار دیا اور سب کو بنی نوع انساں کی حیثیت سے برابر سمجھا گنہگاری کے لئے

مکاروں پر الزام عائد نہیں کیا بلکہ معاشرے اور حکومت کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ فرماتے ہیں

دوست! کون تجھے ڈاکو کہتا ہے۔ کون تجھے چور کہتا ہے۔؟
چاروں طرف ڈکیتی کا ڈنکا بج رہا ہے، چوروں کی حکومت۔
وہ کون خدائی فوجدار ہے جو چور ڈاکو سے محاکمہ کرنے آیا ہے؟
پوچھو ــــ آج دنیا بھر میں ایسا کون ہے جو ڈاکو نہ ہو۔
واعظ صاحب! یہ مذہب کی دہائی بالائے طاق رکھئے۔
چھوٹوں کا سب کچھ چوری کر کے بڑے لوگ آج بڑے بنے ہوئے ہیں۔
جو جتنے بڑے ڈاکو، مکار اور دغا باز ہیں،
وہ اقوام متحدہ کے محاذ میں آج اتنے ہی معزز اور مکرم سمجھے جاتے ہیں۔
رعایا کی خون رستہ اینٹوں سے راجہ کے محل تعمیر ہو رہے ہیں۔
کروڑوں گھر تباہ کر کے سرمایہ داروں اور رہزنوں کے کارخانے پنپ رہے ہیں۔

کوئی تجھے ڈاکو کہتا ہے؟ دوست! کون کہتا ہے کہ تو نے چوری کی ہے۔
دو روپیہ لوٹا، آپ خوردہ چوری کیا ہے مگر کسی کے دل میں چھری تو نہیں بھونکی۔
ممکن ہے تو لٹیرا ہو مگر ان کی طرح انسانیت سے معرا نہیں۔
اے ظالمو! لوگوں کے آگے تم والمیک ہو مگر در اصل ڈاکو ہو۔

(چور۔ ڈاکات سرب ہارا)

نذرالاسلام نے اپنی نظم بارانگنا (طوائف) میں طوائف کو ماں اور ولد الزنا کو معصوم قرار دیا۔ وہ بنگلہ ادب میں پہلے شخص ہیں، جنہوں نے کمینگی میں عظمت، خطاکاری میں معصومیت اور پستی میں بلندی محسوس کی۔ گنہگاروں سے اظہار نفرت کرنے کے بجائے ان سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ گناہ کو براہ راست تختۂ مشق نہ بنا کر اس کا سدباب کرنے کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا چنانچہ فرماتے ہیں۔

اے ماؤں، تمہیں کون طوائف کہتا ہے، تمہیں کون حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے؟
ممکن ہے کہ سیتا جی معصومہ کے گھر میں تمہاری پیدائش ہوئی ہو۔
معصومہ نہ سہی پھر بھی تم ہماری ماؤں اور بہنوں کی ہم جنس تو ضرور ہو۔
تمہارے بچے ہمارے بچوں جیسے ہیں۔ وہ ہمارے ہی ہم رشتہ ہیں۔
وہ ہماری طرح عزت و حرمت کما سکتے ہیں
ان کے عزم کی رسائی ملاء اعلیٰ تک ہو سکتی ہے

اے شیخ سنو،
ایک شہوت پرست انسان کی جائز اور ناجائز اولاد میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔
عصمت فروش ماں کے بچے حرام زادے ہوں،
تو بدمعاش باپ کے بچے بھی حرام زادے ہوں گے۔

انسانی محبت ہی نذرالاسلام کا مذہب تھا۔ ان کا خیال ہے کہ انسان خواہ وہ کتنے ہی برے درجے کا بدکار ہو، پھر بھی وہ انسان ہے۔ انسان دوستی بہترین عبادت ہے۔ اس لئے کہ انسان کا دل مندر اور کعبہ سے بھی بڑھ کر ہے۔ یہ تمام پاک کتابوں اور عبادت خانوں سے بھی برتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے انسانیت کے احترام کو سب کے اوپر جگہ دی ہے اور اس ہمہ گیر احساس ہی نے انہیں فرقہ وارانہ عصبیت سے نجات دلائی ہے۔ جہاں انسانی عظمت کو پامال ہوتے دیکھا وہیں ان کی آواز بلند ہوئی۔ جہاں کسی نے مذہبی تعصبات میں الجھ کر انسانیت کی توہین کی، وہیں شاعر نے اسے عرفانِ نفس کا درس دیا۔ فرماتے ہیں۔

نذرالاسلام نے ہندو مسلم اتحاد کیلئے جان توڑ کوشش کی۔ وہ فرقہ وارانہ تنازعات کو بری نگاہ سے دیکھتے تھے۔ جب کلکتہ میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوئے (۱۹۲۶ء) تو وہ تاڑ گئے۔ اپنا زورِ قلم لے کر اٹھے اور کانڈاری ہوشیار (ناخدا، ہوشیار) کے نام سے ایک زوردار کورس (ترانہ) لکھ کر ملک کے رہنماؤں کو ہوشیار کر دیا۔ کہ اگر ہندو اور مسلمان کے درمیان یہ پھوٹ رہی، تو دونوں

تباہ ہو جائیں گے اور آزادی دھری کی دھری رہ جائے گی ۔ آپس میں لڑ کر طاقت کو صرف کرنے کے بجائے اگر ملک کے عوام اپنی متحدہ کوشش کو برطانیہ سامراج کے خلاف استعمال کریں ، تو ہندوستان کی آزادی یقینی ہے ۔

کانڈاری ہوشیار میں کانڈاری سے مراد رہنمایانِ قوم ہیں ۔ یہاں شاعر قومی کشتی کو وقت کے تمام مصائب و حوادث سے بچا کر آزادی کے ساحل تک لے جانا چاہتا ہے ۔ اس کشتی کا ملاح حب الوطنی کے جذبے سے سرشار اور مذہبی تعصبات سے بالکل پاک ہے اس کے تمام مسافروں کے دل میں بہادری اور آزادی کا جذبہ موجزن ہے ۔ یہ نظم پڑھنے سے شاعر کی حب الوطنی اور جذبہ آزادی کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے قارئین کی دلچسپی کے لئے پوری نظم پیش کی جاتی ہے ۔

ناخدا ! ہوشیار !

کورس ۔

(۱)

دشوار گذار پربت ، لق و دق ریگستان اور بحر بے کنار سامنے ہے
اے مسافرو ! ہوشیار ! گہری رات کو اس راہ سے گذرنا ہوگا ۔
کشتی ڈگمگا رہی ہے ، سمندر موجزن ہے ، ملاح راستہ بھول رہا ہے ۔
بادباں ٹوٹ گیا ہے کس کو پتوار تھامنے کی ہمت ہے ؟
ہے کوئی جواں ؟ آگے بڑھ ۔ مستقبل تجھے بلا رہا ہے ۔
یہ طوفان ملاحیر ہے ، لنگر اٹھانا ہے ۔ کشتی کو پار لگانا ہی ہے

(۲)

رات اندھیری ہے ۔ محبتِ وطن پاسبان لو — ہوشیار !
مدت دراز کے پرینہ درد والم نے جنگ کا اعلان کیا ہے ۔
محروم سینوں میں گہرے احساس انگڑائیاں لے رہے ہیں ۔
انہیں راستہ پر ضرور لانا ہوگا اور حقِ خود ارادیت دلانا ہوگا ۔

(۳)

بے بس قوم ڈوب کر مر رہی ہے، اُسے پتہ یا نہیں آتا۔
اے ناخدا! آج ہم دیکھ لیں گے کہ اپنے وطن کو آزاد کرنے کا تجھ میں عزم ہے یا نہیں۔
کون بدبخت پوچھتا ہے ـــ وہ ہندو ہیں یا مسلمان؟
اے ناخدا! کہہ دے ـــ انسان ڈوب رہا ہے اپنی ماں کی اولادیں ڈوب رہی ہیں

(۴)

پہاڑ جیسی مصیبت ہے۔ قافلہ بزدل ہے سمت بھلی کو مدبر نہیں ہے۔
پس ماندہ مسافروں کے دل میں آج شکوک جاگ رہے ہیں۔
اے ناخدا! کیا تو بھی گم گشتہ راہ ہو جائے گا؟ منجدھار میں تو انہیں چھوڑ دیگا؟
وہ آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں سہی۔ پھر بھی انہیں کھینچ کر آگے لے چل۔
تو نے یہ بھاری ذمہ داری اپنی گردن پر اٹھالی ہے۔

(۵)

اے ناخدا! ـــ تیرے سامنے پلاسی کا وہ میدان کارزار ہے۔
جہاں سپاہیوں کے خون سے کلائیو کا خنجر سُرخ ہوگیا تھا۔
ہائے! اس رودِ گنگا میں ہندوستان کا آفتاب غروب ہوگیا تھا
وہ آفتاب ہمارے خون میں نہا کر پھر طلوع ہوگا

(۶)

وہ تختۂ دار پر چڑھ کر زندگی کے ترانے گا گئے۔
وہ چھپ کر دیکھ رہے ہیں کہ کون قربانی دے رہا ہے۔
آج قوم کے امتحان کا وقت ہے۔ کیا تو اپنی قوم کو نجات دلانے کا عزم رکھتا ہے؟
کشتی ڈگمگا رہی ہے، موجیں متلاطم ہیں۔ ناخدا ـــ ہوشیار!

انسانیت مدراں اسلام کی شاعری کا مرکز ثقل ہے۔ ان کا موضوعِ سخن خواہ کچھ بھی ہو۔ انہیں

مظلوم انسانیت کا راگ الاپے بغیر چین نہیں آتا وہ ہر صنفِ سخن میں کسی نہ کسی صورت میں انسان دوستی کے گیت سناتے ہیں۔ رسولِ کریمؐ کی نعت پر قلم اٹھاتے ہیں تو جمیع اوصاف کی بجائے آپ کی انسان دوستی کا پہلو زیادہ اُجاگر کرتے ہیں فرماتے ہیں

رسولِ کریمؐ وہ ذات پاک ہیں جنہوں نے انسان کو اس کا حق دلایا ہے
جنہوں نے کہا اللہ کے سوا کوئی رب نہیں۔
جنہوں نے انسانیت کی خاطر فقر کا طریقہ اختیار کر لیا۔
جنہوں نے بادشاہ اور فقیر کو ایک ہی صف میں لا کھڑا کیا۔
یہ وہ ہی ہیں جو مظلوم انسانوں کے جذبات کی تصویریں کر
سب کو اپنانے کیلئے اس دنیا میں تشریف لائے۔
آج ساری دنیا نجات کے غلغلہ سے گونج اٹھی ہے
بادشاہ اور فقیر کو ایک ہی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔

(۱ دو الفقار)

حضرت عمر فاروقؓ جیسے رعب دار اور صاحب اقتدار کے نام سے کون واقف نہیں ؟ ان کے فتح و نصرت کے علم بردار سپاہیوں کے سامنے قدیم رومی اور ایرانی سلطنتیں شکستِ فاش کھا گئیں۔ نذرالاسلام ان کی تعریف کرتے ہیں تو خلیفہ موصوف کی ناقابلِ شکست شجاعت و ہمت بجائے ان کی انسان دوستی اور رعایا پروری شاعر کا دل موہ لیتی ہے وہ ان الفاظ میں عمر فاروق سے دلی محبت اور حسنِ عقیدت کا اظہار کرتے ہیں -

تو نے انسان سے دوستی کی - ہر انسان کو بھائی سمجھا -
اس لئے تجھے ہمیشہ آنسو بہا کر یاد کرتا ہوں -
پیارے دوست تجھے سلام کرتے ہوئے یہ ہاتھ
اوپر نہیں اٹھتے بلکہ وہ تجھے اپنے سینے سے لگا لیتے ہیں -

جس وقت نذرالاسلام کی شاعری شباب پر تھی - اس وقت ملک میں سوراج کی تحریک

ہ تحریک۔ ترکِ موالات کی تحریک، کسان کی تحریک غرض متعدد تحریکیں دوروں پر تھیں سیاسی پارٹیوں میں مناقشات بھی ہو رہے تھے مگر نذرالاسلام پارٹی سیاست سے بالاتر تھے سیاسی کشاکش اور دھڑے بندی میں نہیں الجھے ان کی زبان پر ہمیشہ فاقہ کشی سے ترستے ہوئے لوگوں کی روداد تھی۔ انہوں نے قوم کے غم میں حکام کے ساتھ ڈر نہیں کھایا نام نہاد لیڈروں کی عیش و آرام کے ساتھ رہ کر قوم کے رنج کی صدائیں بلند نہیں کیں بلکہ غریبوں اور مظلوموں کے دوش بدوش کھڑے ہوکر انہیں پستی سے نکال کر ترقی کی شاہراہ پر لانے کی کوشش کی سیاسی تحریکوں میں رہ کر انہوں نے بے کسوں اور بلاکشانِ دردوں کے درد و الم کی تصویریں کھینچیں۔

بھوکا بچہ سوراج کا خواہشمند نہیں۔
وہ چاہتا ہے۔۔۔ مٹی بھر بھات اور ذرا سا نمک۔
دن چڑھ رہا ہے مگر میرے بچے کو اب تک کھانے کو کچھ بھی نہیں ملا ہے۔
میں مجنوں کی طرح دوڑا آتا ہوں۔
سوراج کا نشہ کہیں کھو جاتا ہے۔!
میں رو رو کر کہتا ہوں ۔۔ اے خدا! تو اب بھی موجود ہے؟
ان پر تیرا قہر کیوں نہیں ٹوٹتا جو اس بچے کا خون چوستے ہیں۔

(آمارکیفیت، سرب ہارا)

نذرالاسلام کی انسان دوستی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے انسانی عیش و آرام کے لئے اپنا عیش و آرام وقف کر دیا۔ لوگوں میں سیاسی اور سماجی شعور پیدا کرنے کے لئے در در پھرے۔ آزادی کی تحریک سیاسی اور سماجی کاموں میں براہِ راست حصہ لیا۔ مجلسوں اور جلسوں میں شرکت کی قوم کو بلایا۔ قوم نے ان کی آواز پر لبیک کہا۔ انہوں نے سوتی ہوئی قوم کو جھنجھوڑا اور قوم نے ان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ انہوں نے پرانے نظام کو بدل کر نیا نظام قائم کرنے کا تصور پیش کیا۔ ہر ظلم و ستم کے خلاف صدا بلند کیا۔ دنیا میں بہت ہی کم شاعر ایسے ہوتے ہیں جن کے یہاں گفتار و کردار میں پوری پوری مطابقت پائی جاتی ہو۔ نذرالاسلام کا کردار ان کی گفتار کی تصویر ہو۔ انہوں نے

اپنی زندگی کو خدمتِ خلق کے لئے وقف کردیا۔ پرنسپل ابراہیم صاحب کے ایک خط کے جواب میں انہوں نے لکھا۔ (۱۹۲۷ء)

مری زندگی کتنی ہی المیہ کیوں نہ ہو، میں مسرت اور دکھ درد کے گیت گاتا جاؤں گا۔ اسے کو سب کے لئے پورا پورا وقف کردوں گا۔ سب کی زندگی میں میری زندگی ہے۔ یہی میرا مسرت ہے۔ یہی میرا عزم ہے، یہی میرا دھیان ہے۔

(جوگ مہیشا ندرل)

واقعی انہوں نے اپنے کو خدمتِ خلق کیلئے وقف کردیا۔ ان کی ہمدردی اور خلوص میں کسی کو ذرہ برابر شک ہو تو وہ ان کے الفاظ ایک مرتبہ دیکھ لے۔

نذرالاسلام نے اپنے ایک چشم دید واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے

اس دن میں گاڑی میں دیکھا ـــــ
بابو صاحب نے ایک قلی کو ڈھکیل کر نیچے گرا دیا
یہ دیکھ کر میری آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔
کیا یوں ہی دنیا بھر میں کمزور مار کھاتے نہیں گے؟

نذرالاسلام کے دل میں مظلوم انسانیت کے لئے سچی تڑپ اور بے لوث محبت نہ تی تو ان کے قلم سے ایسے الفاظ کیسے نکل سکتے تھے یہ الفاظ نہیں درد و غم کی تصویریں ہیں۔ ان کی شاعری دماغی عیاشی اور تفننِ طبع کا ذریعہ نہیں۔ بلکہ مظلوم انسانیت کے دل کی آواز ہے۔ انہوں نے اپنا یہ فرض ادا کرکے بالآخر مظلوم انسانیت کے سدھانے کا بار خدا کے سپرد کردیا۔ فرماتے ہیں۔

اے خدا!

اس دنیا میں تیری خاک آلود اور بے بس مخلوق اپنے دکھ درد کا علاج مانگتی ہے اے ازلی خدا!

ذرا سُن لے !

میں اپنی آنکھوں کا دکھ بھرا دیپ لے کر

تیری کائنات کے گوشے گوشے میں پھر رہا ہوں

جدھر بھی نگاہ اٹھاتا ہوں، محوِ حیرت رہ جاتا ہوں۔

میرا دل پھڑک اٹھتا ہے۔

تو کتنا پیارا ہے، تو ہم سے کتنی محبت رکھتا ہے!

تو کتنا عظیم الشان ہے!

نذرالاسلام کی نگاہ میں عورت

"وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ" (القرآن)

(اور ضابطے کے مطابق مردوں پر عورتوں کے بھی حقوق ہیں۔ جیسا کہ ان پر مردوں کے حقوق ہیں)

میری نگاہ میں مرد اور عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں ——— (نذرل)

مذہب اور اخلاق کے بہانے عرصہ دراز تک عورتوں پر مظالم ڈھائے جاتے رہے معاشرے میں ان کی کوئی اہمیت نہ تھی ان کے ساتھ من مانا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ ان کے حقوق پامال کیے جاتے تھے۔ قدیم بنگلہ ادب کے ارباب قلم نے عورت کی جداگانہ حیثیت اور ان کی آزادی کی تحریک پر قلم نہیں اٹھایا۔ عورت پر ظلم ڈھائے جاتے دیکھ کر بھی انہوں نے خاموش تماشائی کا کردار ادا کیا۔ کسی نے اس ظلم و ستم کا ذکر کیا بھی، تو اس کا علاج پیش نہیں کیا دو چار گنے چنے اشخاص نے اس موضوع پر قلم اٹھایا بھی تو انہوں نے ان ناانصافیوں کا ازالہ کرنے کیلئے مؤثر قدم نہیں اٹھایا ڈنکے کی چوٹ عورتوں کی جداگانہ معاشرتی حیثیت ثابت کرنے کی آواز بلند نہیں کی۔ ان میں اس قدر جرأت نہ تھی کہ قدیم رسم و رواج پر کاری ضرب لگائیں۔

ہمارے ملک میں انیسویں صدی کے ابتدائی حصہ میں معاشرے کی اس مسموم ذہنیت میں تبدیلی واقع ہوئی۔ شوہر کی موت پر اس کے ساتھ ساتھ بیوی کو بھی نذر آتش کر دینا ہندوؤں کے مذہبی رسوم میں داخل تھا۔ راجہ رام موہن رائے (۱۷۷۲ء ـــ ۱۸۳۳ء) نے اس وحشیانہ رواج پر کاری ضرب لگائی۔ ودیا ساگر (۱۸۲۰ء ـــ ۱۸۹۱ء) نے بیوہ کی شادی کو رواج دے کر انسانیت کا بڑا احسان کیا۔ ان تحریکوں کے اثر سے بنگلہ ادب میں بھی آزادیٔ نسواں کی تحریک وجود میں آئی۔ مرد اور عورت کی علیحدہ

حیثیت تسلیم کی جانے لگی۔ ادیب اور شاعر وسیع پیمانوں پر عورت کی معاشری حیثیت پر قلم اٹھانے لگے۔ آزادیٔ نسواں کی جو تحریک مدھوسدن، بنکم، تارک گنگو پدیائے وغیرہ سے شروع ہوئی تھی، وہ ربندرناتھ، سرت چندر (۱۸۷۶ء ۔ ۱۹۳۸ء) اور دوسرے ادبا و شعراء کے وقت منتہائے کمال پر پہنچی۔ اس سلسلے میں نذرالاسلام کا نام قابلِ ذکر ہے۔ انہوں نے ان تحریکات در اسلامی جذبات و احساسات سے اترے کر عورت کی سماجی حیثیت، اس کی عظمت اور اس کے حقوق کے متعلق آواز بلند کی۔

نذرالاسلام ترقی کی راہوں میں کہیں روڑا نہیں اٹکایا۔ وہ زندگی کے علم بردار شاعر ہیں۔ ان کو معلوم تھا کہ قوم کا نصف مرد ہے اور نصف عورت۔ انہوں نے ایک انسان کی حیثیت سے نیز معاشرے کے ایک فرد کی حیثیت سے مرد اور عورت کے برابر حقوق تسلیم کرلئے حرم میں پابند عورتوں پر سے معاشرے کی بیجا پابندیوں کو ہٹانے کی ہرممکن کوشش کی۔ نادان سماج نے عورتوں کے ساتھ جو ناانصافیاں روا رکھی تھیں، اس کے خلاف شاعر نے اپنی نظم ناری (عورت) مسس ایم رحمٰن " اور بارنگنا ' (طوائف) میں آواز بلند کی۔ انہوں نے اس حقیقت کو کھلم کھلا بیان کیا کہ عورت مرد کی نفسانی خواہشات کی تسکین کا یا محض اولاد پیدا کرنے کا آلہ نہیں۔ بلکہ اس سے بلند تر مقصد کے پیشِ نظر یہ جنس فطرت کی آغوش میں جنم لیتی ہے۔ عورت گہوارۂ تمدن ہے دنیا کے آرٹ، تہذیب و تمدن کی تاریخ میں اس کا بھی ایک معتد بہ حصہ ہے۔ بے بنیاد مذہبی اور اخلاقی اصولوں کی دہائی دے کر جہاں مرد نے عورت کی زندگی دوبھر کر رکھی تھی۔ وہیں شاعر نے ڈنکے کی چوٹ معاشرہ کو اس کی آزادی اور مساوات کا پیغام سنایا :-

وہ زمانہ بیت گیا ہے ـــــ

جب مرد غلام نہ تھا اور عورت مرد کی لونڈی بنی ہوئی تھی۔

یہ ہمدردی، انسانیت اور مساوات کا دور ہے۔

اب یہی آواز ہر جگہ سنائی دیتی ہے کہ کوئی کسی کا غلام نہیں رہے گا۔

اگر مرد نے عورت کو قید کرنے کی کوشش کی تو عنقریب

اسے اپنے بنائے ہوئے قید خانے میں مصیبت جھیلنی ہوگی۔

دورِ حاضر کا تقاضا یہ ہے ——

تو ظلم توڑے گا، تو آخر وہ ظلم تجھ ہی کو ستائے گا۔

عورت کمتر جنس نہیں۔ اس میں بھی فطرت نے بے انتہا صلاحیتیں ودیعت کر رکھی ہیں مگر چونکہ وہ اپنی حقیقت سے آگاہ نہیں ہے اس لئے اسیرانہ زندگی کی زحمت اور توہین کو بے روک ٹوک گوارا کر لیتی ہے۔ شاعر نے اس خوابیدہ حس کو بیدار کیا اور اسے اپنا حق طلب کرنے پر اکسایا۔ فرماتے ہیں۔

آج تم مرد سے آنکھ نہیں ملا سکتی ہو۔ تمہارے ہاتھ میں چوڑیاں اور پاؤں میں گھونگھرو ہیں۔

اے عورتو! تم حیا کا گھونگھٹ پھاڑ دو۔ اس زنجیر کو توڑ دو۔

جس گھونگھٹ نے تمہیں بزدل بنا رکھا ہے، اسے ٹھکرا دو۔

تمام زیورات کو جو کہ لونڈی پن کی علامتیں ہیں، پھینک دو۔

نذرالاسلام نے نئی دولہن کو بھی اپنی عزتِ نفس اور احساسِ ذمہ داری کا سبق دیا اُسے یہ ہدایت کی کہ وہ ازدواجی زندگی کو اپنی نئی زندگی سمجھے۔ ہمیشہ عفیفانہ زندگی گذارے شوہر کی خیر خواہ بن کر اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنی رہے۔ اس کی بے راہ روی پر اپنی ہمدرد اور ہنر مندانہ روک ٹوک سے اس کی آنکھیں کھول دے۔ اسی میں اس کا کمال ہے۔ اس سے اس کی نسوانی عظمت عیاں ہوتی ہے

اقبال کا خیال ہے کہ بے مدد مرد عورت کے جوہر کی نمود نہیں ہوسکتی۔ مگر عورت بغیر بھی مرد کا جوہر عیاں ہو سکتا ہے۔

اقبال فرماتے ہیں۔

جوہرِ مرد عیاں ہوتا ہے بے منتِ غیر
غیر کے ہاتھ میں ہے جوہرِ عورت کا نمود

مگر نذرالاسلام کا خیال ہے کہ عورت سے بھی مرد کا جوہر عیاں ہو سکتا ہے۔ فرماتے ہیں

آج شادی کے رنگ میں سب رنگے ہوئے ہیں
دل بھی رنگین ہے۔ رات بھی رنگین ہیں۔
اے عورت کہہ دے ۔۔۔ آج ان رنگ رلیوں میں
میری نئی بیداری ہے۔
تیرا رجحان گناہ کی طرف نہ ہو۔ اپنے شوہر کی خیر خواہی کی طرف ہو۔
شوہر کی رہنمائی کر رہ
اے معصومہ! تیرا شوہر اندھا اور بالفرض بھی ہو
تو اس کی طرف سے آنکھ بند نہ کر۔
تجھے اپنے اندھے شوہر سے اسی طرح پیش آنا چاہیے۔
کہ تیرا نیک برتاؤ اس کی آنکھیں کھول دے۔

(مدھو برن، سندھو ہندول)

نذرالاسلام نے صرف نام نہاد مہذب اور معصوم عورتوں کے حق خود ارادیت کی حمایت نہیں بلکہ غیر معصوم اور ادنیٰ درجے کی عورتوں سے بھی انتہائی ہمدردی کا اظہار کیا۔ اور انھیں تو مذلت سے نکال کر شاہراہِ عظمت و وقار پر لا کھڑا کیا۔ ان کے خیال میں سماج کی بدترین عورت میں بھی دلی حسن اور انسانی عفت موجود ہے۔ معاشرتی اصول کے مطابق کوئی عورت کیسی ہی کمینہ کیوں نہ ہو، آخر وہ بھی معصوم محنت کی بدولت شرافت کی مستحق بن سکتی ہے۔ انسان سخت سے سخت گناہ کا مرتکب کیوں نہ ہو، پھر بھی اس کے لئے نیکی کا دروازہ کھلا رہتا ہے اس بدکار سے نفرت کرنے کے بجائے بدی سے نفرت کرنا چاہئے۔

نذرالاسلام نے عورتوں کو صرف رسم و رواج کے خلاف بغاوت کرنے کی ترغیب نہیں دی بلکہ انہیں محبوبۂ دلہن پیاری ماں اور عزیز رفیقۂ حیات کی حیثیت سے بھی پیش کیا۔ انھیں اپنی فرض شناسی کا سبق پڑھایا۔ اپنی عزت و حرمت اور عصمت و عفت محفوظ رکھنے کا درس دیا۔

اپنے شوہر کی پاسداری کرنے کی ہدایت کی ۔ نذرالاسلام سے پہلے ہی راسندرناتھ اور شرت چندر وغیرہ نہایت آب و تاب کے ساتھ نسوانی حقوق اور سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر قلم اٹھا چکے تھے اس میں نذرالاسلام کوئی خاص جدت نہیں دکھا سکے ۔

البتہ ان کا امتیاز اس میں ہے کہ انہوں نے صور اسرافیل سے عورتوں کو بیداری کا عام سنایا اور اس طرح آزادیٔ نسواں کی تحریک کو زیادہ مؤثر بنایا ۔ فرماتے ہیں ۔

اے ماؤ ! بیٹیو ! بہوؤ ! بہنو ۔ اے پامال ہستیو !
تم زوال پذیروں کو نجات دلانے والی ہو ۔ جنت سے اتری ہوئی ہو ۔
تم گنگا کی تیز رفتاری کے ساتھ جاگ اٹھو !
اے کنواریو ! تم ابر میں کڑک کی گرج پیدا کرو ۔
اے عورتو ! تم ہمیشہ سے فتح یاب ہو ۔ تم جاگ اٹھو !

(نذرل گیتکا)

نذرالاسلام اور سنگیت

گذر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

(اقبال)

میرے ایک ہاتھ میں ٹیڑھے بانس کی بانسری ہے
دوسرے ہاتھ میں طبلِ جنگ ہے۔

(نذرالاسلام)

عام طور پر نذرالاسلام "باغی شاعر" کے نام سے مشہور ہیں۔ انقلابی نظموں نے انہیں ہردلعزیز بنایا۔ مگر ہمیں یہ فراموش نہ کرنا چاہئے کہ سنگیت میں بھی ان کا درجہ بہت بلند ہے۔ اس میں ان کی شاعرانہ عظمت کا مکمل ظہور ہوا ہے۔ اسی صنف میں ان کا جمالیاتی حسن اور فن کارانہ کمال نمایاں طور پر اجاگر ہوا ہے۔ حسنِ ازل اور پائیدار زندگی کا ادراک کرنے کی جو کوشش اور بیتابی انکے ابتدائی کلام میں شروع ہوئی تھی، وہ "سلسل"، "پو بیرہوا"، "جو کیھر جایتک"، "ذوالفقار"، "گل باغیچہ"، "سرساقی" وغیرہ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

سادگی، سلاست، روانی اور شیرینی ان کے نغموں کی خاص خاص خوبیاں ہیں۔ مطالب اور رکوں کے تنوع، لفظی اور معنوی حسن نے ان گیتوں کو دلکش بنا دیا ہے۔ کیفیت اور راگ راگنیوں کا جو تنوع انکے سنگیت میں ملتا ہے۔ بنگلہ ادب کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ ان کی نظموں میں بلاشبہ کہیں کہیں جذبات کی شدت نظر آتی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے کلام میں بعض مقامات پر سطحیت، بے ربطی اور طوالت پیدا ہو گئی ہے۔ مگر سنگیت کے فنی شرائط اور حدبندیوں نے ان کے گانوں میں متانت

اور نظم و نسق پیدا کر دیا ہے۔ ان کے گانوں میں کہیں حیرت انگیز تیزی، کہیں فکر کی گہرائی، اور کہیں جاذب توجہ رومانیت پائی جاتی ہے۔

ممکن ہے ان کی انقلابی نظمیں کو جو وقتی ضرورتوں کی بنا پر وجود میں آئیں، حیاتِ جاوید نہ ملے اور وہ فن برائے فن کے قائلین کی ادبی پیاس نہ بجھا سکیں۔ مگر یقین کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ سنگیت کی بدولت بقائے دوام کے دربار میں ان کے لئے ہمیشہ ایک ممتاز مقام محفوظ رہے گا۔

اُردو کے شاعر جوش ملیح آبادی کی طرح نذرالاسلام کی شاعری میں بھی بظاہر اضداد کا اجتماع نظر آتا ہے وہ بیک وقت شاعرِ انقلاب بھی ہیں اور عاشقِ سرمست بھی۔ وہ بغاوت کرتے ہوئے بھی حسن و عشق کو نہیں بھولتے۔ ان کے یہاں جلال و جمال، تلخی و شیریں دونوں پہلو بہ پہلو نظر آتی ہیں۔ مثلاً ان کی شہرۂ آفاق نظم "بدروہی" کو لیجئے ـــــ اس میں نذرالاسلام اپنی بغاوت کی رو میں دنیا کو ٹھوکر سے اڑا دینا چاہتے ہیں ـــ

فرماتے ہیں -

"میں توڑ پھوڑ کر سب کچھ مسمار کر دیتا ہوں۔"

مگر دوسری طرف حسن و جمال اور عشق کے ترانے بھی گائے جاتے ہیں -

میں نظر آنے والی محبوبہ کی سہمی ہوئی نگاہ ہوں، جو عشوہ گری کے ساتھ ہمیشہ تاکتی رہتی ہے۔

میں چنچل کنواری کا عشق ہوں اس کے کنگن اور چوڑی کی میٹھی جھنکار ہوں۔

میں سدا طفل اور سدا نوجوان ہوں۔

میں دیہات کی مستِ شباب لڑکی کا آنچل اس کی محرم اور گھگرا ہوں۔

(بدروہی ۔ اگنی بینا)

بغاوت کے پہلو بہ پہلو نذرالاسلام کی اس حسن پرستی کو بعض لوگوں نے حسن کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ باغی اصولاً حسن پرست نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ حسن و عشق کی نیازمندی اور خود سپاری کے پہلو بہ پہلو بغاوت کی تندی و تیزی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔

بات یہ ہے کہ نذرالاسلام حقیقتاً حسن کے شاعر تھے۔ حسن کی تشکیل ان کی منزلِ مقصود تھی۔ انہوں نے
کہا ــــ شاعر کیٹس کی طرح میں بھی اس نظریہ کا حامی ہوں۔

"Beauty is truth, truth is beauty"

ان کی شاعری پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ حسن و عشق کے نغموں کے ساتھ اس کا آغاز ہوا۔
اور اسی پر اس کی تان ٹوٹی۔ بغاوت ان کی گھٹی پر نہیں پڑی تھی۔ وہ جنگجو یا تخریب پسند ہو کر پیدا
نہیں ہوئے تھے مگر ماحول اور سماج کے ناگفتہ بہ حالات نے انہیں باغی بنا دیا۔ انہوں نے خود کہا ــ

دوستو! زیادہ کہہ نہیں سکتا ہوں۔ اس سینے میں سخت زہریلے جذبات ہیں
جان بوجھ کر غضبناک ہو گیا ہوں۔ اسی لئے جو بات زبان پر آتی ہے کہے جاتا ہوں۔

نذرالاسلام نے بغاوت اس لئے کی کہ اس سے حسن کی تعمیر ہو اور ایک ایسا جہانِ نو وجود
میں آئے، جہاں لوگ چین سے زندگی گذار سکیں اور انہیں حسن و جمال کی قدر کرنے کا موقع ملے۔ یہی
وجہ ہے کہ بغاوت کے وقت بھی وہ حسن و جمال کو فراموش نہیں کر سکتے۔ جلال و جمال دونوں دھوپ
چھاؤں کی طرح ان کے ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ انہوں نے خود کہا ۔

" میرے ایک ہاتھ میں ٹیڑھے بانس کی بانسری ہے اور
دوسرے ہاتھ میں طبلِ جنگ ــــ"

نذرالاسلام ایک خلاق اور طباع شاعر تھے۔ وہ ایک ہی نوع کی انقلابی نظموں میں کیوں
کر الجھے رہ سکتے تھے۔ وہ زندگی کی ہماہمی میں رہ کر کبھی گاہے گاہے اپنے دل کی گہرائی میں پناہ لیتے
ہیں اور حسن و عشق کے ترانے گاتے تھے۔ کبھی کبھی روحانیت کے اتھاہ سمندر میں ڈوب کر راز و نیاز
کی باتیں بھی کیا کرتے۔ یہ ان کی شاعرانہ اُپج اور اس کے ظہور کے مختلف درجات ہیں مگر ان کی اس
رنگا رنگ شاعری کی تہہ میں وحدتِ خیال ضرور کارفرما ہے۔ وہ ہے ــــ حسن کی تلاش اسی کے لئے
ان کی بغاوت ہے۔ اسی کے لئے ان کی شاعری اور ان کا سنگیت وقف ہے۔ ان کا جلال جمال
ہی کے لئے ہے۔ انسانیت کی نجات اور عالمگیر ملی محبت میں انہیں حسن و جمال نظر آتا ہے۔
یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی باغی بن جاتے ہیں اور کبھی حسن کے پجاری۔ انہوں نے اپنی نظم "بدروہی"

میں کہا ۔

بھائی! میرا دل جس وقت جو چاہتا ہے میں وہی کرتا ہوں ۔

یہی وجہ ہے کہ "اگنی بینا" کے بعد "دولن چانپا"، "بھانگا رگان" اور "بشیر بانسی" کے بعد "سندھو ہندول" اور "ململ جیسی" کتابیں ان کے قلم سے نکلی ہیں ۔

شاید یہ سرزمینِ بنگال کی خصوصیت ہے کہ یہاں کے بیشتر لوگ مرنجا مرنج، شوقین اور سنگیت کے دلدادہ ہیں ۔ بہت سے شاعر بیک وقت گیت نویس بھی ہوتے ہیں اور موسیقار بھی ۔ نذرالاسلام کی فطرت میں بھی سنگیت کا رچاؤ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا ۔ وہ رابندر ناتھ کی طرح بیک وقت نظم نویس بھی ہیں اور گیت نگار بھی ۔ راگ راگنیوں کے موجد بھی ہیں اور فن کار بھی ۔ رابندر ناتھ ٹیگور کے بعد بنگلہ سنگیت میں جو ترقی ہوئی ہے، وہ زیادہ تر نذرالاسلام ہی کی مرہونِ منت ہے ۔ انہوں نے ٹھمری، غزل، خیال، دھرپد، کیرتن، باؤل، بھاٹیالی، ٹپّا، جھومر، اسلامی سنگیت، شیاما سنگیت، مرثیہ، بھاؤیا، غرض گیت کی مختلف صنفوں اور شعبوں میں طبع آزمائی کی اور اچھی خاصی مہارت کا ثبوت دیا ۔

نذرالاسلام نے ہندوستانی موسیقی کا چرچا کر کے اسی پر بس نہیں کیا، بلکہ عرب، ایران، ترکستان غرض مختلف ممالک کے سنگیت سے نئی نئی راگ راگنیوں کو مستعار لے کر بنگلہ سنگیت میں ایک حیرت انگیز تنوع پیدا کیا ۔ انہوں نے ہر اس نئے سُر کو جو ان کے کان میں پڑا، اپنے گانوں میں ملانے اور ملک میں رائج کرنے کی کوشش کی ۔ ملاتہ وحند رلال مغربی سنگیت کے ماہر تھے ۔ انہوں نے ہوبہو ولایتی طرز کے بہت سے گانے لکھ کر بنگلہ سنگیت کو مغربی گانوں کی توانائی بخشنے کی کوشش کی مگر وہ طرز مقبول نہ ہو سکا ۔ برخلاف اس کے نذرالاسلام نے غیر ملکی سُروں کو بنگلہ سنگیت کے سانچے میں ڈھال کر استعمال کیا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی درآمد کی ہوئی راگ راگنیوں کے رواج پانے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی ۔ سنگیت پر ان کا احسان یہیں ختم نہیں ہو جاتا ۔ انہوں نے مستقل راگوں کی تخلیق سے بھی بنگلہ سنگیت کے سرمائے میں وسعت پیدا کی ۔ اس سلسلے میں "دولن چمپا"، "بن کنتلا"، "سندھ مالتی"، "بے نوکا"، "برجھرنی"، "پرتاپ ملاری" وغیرہ قابلِ ذکر ہیں ۔

نذرالاسلام خوش الحان نہ تھے۔ مگر خلوص اور تہِ دل سے گاتے تھے اس وجہ سے ان کے گانوں کی دلکشی بڑھ جاتی ہے اور ان کا اثر دوبالا ہو جاتا تھا۔ ابتدائی عمر میں انہوں نے "لیٹو ناچ" میں شرکت کی تھی۔ اسی وقت انہوں نے موسیقی کے فن میں مشاقی حاصل کر لی تھی۔ مزید برآں کلکتہ میں استاد ضمیر الدین سے بھی انہوں نے اس کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے سن گیتی کو اپنے استاد کے نام معنون کر کے خراجِ عقیدت پیش کیا۔

نذرالاسلام کو جدید سنگیت کا نقیب خیال کیا جاتا ہے۔ جدید سنگیت کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں راگ مخلوط ہو، راگ میں زبان و بیان اور خیالات و احساسات دونوں کی یکساں کارفرمائی ہو اور عوام کے ذوق کے مطابق دلکش سُر موجود ہیں۔ نذرالاسلام ہی نے اولاً ان چیزوں کا کامیاب تجربہ کیا۔ صرف یہی نہیں کہ انہوں نے مختلف راگ راگنیوں پر گانے لکھے بلکہ ان کے ردّ و بدل اور الٹ پھیر سے نئے نئے سُر ([illegible]) بھی ایجاد کئے۔ اور اسی میں ان کا کمال ہے۔ انہوں نے گانوں کو خاص خاص راگوں کے ساتھ محدود نہیں رکھا، بلکہ بسا اوقات ایک ہی گانے کو کسی خاص راگ کے سانچے میں ڈھال کر اس میں دوسرے راگ کے سُر کا بھی امتزاج پیدا کیا ہے سُر کے تنوع کے اعتبار سے سنگیت کی تاریخ میں شاید ہی کوئی ان کا ہمسفر ہو۔

ٹیگور نے فن کاروں کو ان کے گانوں میں اپنی مرضی کے مطابق سُر ملانے کی اجازت نہیں دی مگر نذرالاسلام نے نغمہ سازوں کے لئے یہ گنجائش رکھی کہ وہ چاہیں تو گیتوں کا بنیادی طرز برقرار رکھتے ہوئے ان میں اپنی اپنی پسند کے مطابق سُر ملا سکتے ہیں اور چاہیں تو شاعر کے طرز کو بدل کر انہیں دوسرے انداز میں بھی گا سکتے ہیں۔ اسی گنجائش نے ان کے گانوں کی دلچسپی اور مقبولیت میں اضافہ کیا ہے۔ دلیپ کمار رائے، اِندو بالا، انگور بالا، کملا جھریا، ہرمتی۔ کے۔ ملک۔ نلنی سرکار۔ عباس الدین وغیرہ نے نذرالاسلام کے گانوں کو گا گا کر ہر دلعزیز بنایا۔

رابندرناتھ ٹیگور کے گانوں کی تعداد تخمیناً ڈھائی ہزار بتائی جاتی ہے نذرالاسلام اس سے کہیں زیادہ گانوں کے خالق ہیں۔ مگر ان کی صحیح تعداد بتانا مشکل ہے۔ بعض نے چھتیس سو بتائی ہے بہرحال یہاں تک یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے تین ہزار سے بھی زیادہ گانے لکھے ہیں۔

سنگیت کی تاریخ میں شاید ہی کسی کا اتنا بڑا ریکارڈ موجود ہو۔ ان کے گانوں کے جتنے ٹیپ ریکارڈ وجود میں آچکے ہیں، اتنے دنیا کے کسی اور شاعر کے گانوں کو نصیب نہیں ہوئے مشہور فن کار عباس الدین کے قول کے مطابق ان کے گانوں کے جو ریکارڈ دستیاب ہو سکے ہیں، ان کی تعداد پندرہ سو چورانوے ہے۔

ہر شاعر گیت نگار نہیں ہوتا۔ اسی طرح ہر گیت نگار بھی شاعر نہیں بن سکتا۔ گیت نگاروں میں بعض کے یہاں خیالات کی کارفرمائی زیادہ ہوتی ہے اور بعض کے یہاں راگ راگنیوں کا غلبہ ہوتا ہے خیالات اور سروں کی یکساں کارفرمائی بہت ہی کم شعرا کے یہاں نظر آتی ہے۔ ربندر ناتھ اور نذرالاسلام کے اعلیٰ سنگیتوں میں مضمون اور سُر دونوں کو یکساں اہمیت حاصل ہے۔ افکار کی بلندی اور خیالات کی گہرائی ٹیگور کے گانوں کو جداگانہ حیثیت بخشتی ہے۔ تو سُروں کی جھنکار، عبارت کی روانی اور کلام کی بیجانی کیفیت نذرالاسلام کے سنگیت کو تمام شعراء کے سنگیت سے ممتاز بنا دیتی ہے۔ ٹیگور کی گہرائی تک عوام کی رسائی نہیں ہوتی۔ اس لئے اس کے گانے صرف تعلیم یافتہ حلقوں میں مقبول ہیں۔ اور زیادہ تر خواص کی محفلوں میں گائے جاتے ہیں۔ عوام کی زندگی سے ان کا قریبی واسطہ نہیں۔ اس لئے عوام کو ان کے گانوں میں وہ لطف نہیں ملتا جو نذرالاسلام کے یہاں ملتا ہے۔

نذرالاسلام پہلے شخص ہیں جنہوں نے گیتوں کو خواص کے حلقوں سے نکال کر گھر گھر پہنچا دیا۔ نئے نئے سُروں کی شمولیت سے انہوں نے سنگیت کو عوام کے ذوق کے مطابق بنایا۔ انہوں نے راگ راگنیوں کے بندھے ٹکے قوانین اور استادانہ ماریچ سے آزاد کیا اور اس سے دیہاتی فنکاروں کے لئے سنگیت میں اپنا جوہر دکھانے کا راستہ ہموار کیا۔ دوسری طرف استادی گانوں میں لوک گیت کے فطری سروں میں ملا کر دیہاتی گانوں کی طرف تعلیم یافتہ طبقے کی توجہ منعطف کی۔

سنگیت کے ذریعے نذرالاسلام نے حب الوطنی، انسان دوستی، عاشقانہ جذبات، روحانی عشق و محبت، غرض ہر قسم کے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ ان کے گانوں میں کسان، مزدور، سپاہی عاشق، پیر فقیر، جوگی، ملاح، سادھو، ٹھاکر یعنی ہر طبقہ کے انسان کو اپنے دل کی باتیں ملتی ہیں۔ انسانیت کی نجات ان کی شاعری کا مرکزی خیال ہے۔ اسی کے اطراف میں ان کی فکری دنیا تعمیر ہوئی ہے انہوں نے اپنے گانوں کا ایک بڑا حصہ مظلوم عوام کے دل کی دھڑکنوں کی ترجمانی کے لئے وقف کر دیا ہے

انہوں نے خود کہا :-

جس درد سے میرا دل رات دن دھڑکتا ہے
میرے سنگیت کے سُروں میں اس کی لہریں اٹھتی ہیں۔

نذرالاسلام نے آپ بیتی میں جگ بیتی پیدا کی۔ ان کی محبت وہ محبت ہے جو کائنات کے ہر ذرے کے ساتھ ہو، ہر ذی حیات کے ساتھ ہو، ہر فرد و بشر کے ساتھ ہو، حیات اور حیات کے ماخذ کے ساتھ ہو۔ انہوں نے اپنے گانوں کے آسان اور دلکش اسلوب بیان سے عامۃ الناس کو لطف اندوز ہونے کا موقع دیا۔ یہی وجہ ہے کہ رکشا والوں سے لے کر حرم کی خواتین بھی ان کے گانوں سے دلچسپی لیتی ہیں۔ دیہات کے گوشے گوشے میں کسانوں اور بھیڑ بکری چرانے والوں کی زبان سے یہ آواز سنائی دیتی ہے :-

تو کون پردیسی ہے کہ جنگل میں متوالا بن کر
بانس کی بانسری بجا رہا ہے؟
تیرے محبت خیز سُروں سے
لالہ زار کے گل بدنوں پر خواب طاری ہو رہا ہے

(بُلبُل)

نذرالاسلام نے قومی سنگیت، عشقیہ سنگیت، فطرت کے گیت، شیام سنگیت، دستو سنگیت، اسلامی سنگیت، طنزیہ اور مزاحیہ گانے، غرض ہر نوع کے سنگیت میں ہاتھ ڈالا اور غیر معمولی کامیابی کا ثبوت دیا۔ بیشک سودیشی تحریک کے وقت ٹیگور کے سودیشی گانوں سے لوگوں میں سیاسی شعور پیدا ہوا تھا۔ مگر اس بیداری کے ساتھ ساتھ عوام میں سماجی بیداری کا وہ ایجابی شعور نہیں ابھرا تھا جو بعد میں نذرالاسلام کے حب وطن پر لکھے ہوئے گانوں سے وجود میں آیا ہے۔ اب تک قومی گیت عام طور پر شخصی رنگ لئے ہوئے تھا۔ مگر نذرالاسلام کے کورس گانوں کے ساتھ اجتماعی شعور اور تاریخی احساس نے ایک نئے روپ کا آغاز ہوتا ہے۔ تحریک خلافت اور ترکِ موالات کے زمانے میں جب ٹیگور کی آواز ماند پڑ گئی تھی، تو نذرالاسلام نے اس کمی کو پورا کیا۔ ان کے قومی اور کورس گانوں نے تحریکِ آزادی

کو ہمہ گیر اور پوردار بنایا۔ عوام کے حصولِ آزادی کی اُمنگ اور مجاہدانہ جوش و جذبے کی ترجمانی کی۔ اور اس ترجمانی میں وہ لاثانی نظر آتے ہیں۔ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے قومی اور روحی ترانوں میں مارچنگ (Marching) اور بینڈ (Band) کا شر پیدا کیا۔ اس سلسلے میں ان کے گانے 'درگم گری کا تار مرو دستر بار بار (سرب ہار)، آمراستکتی، آمرا ل، آمرا چھا تر دل' (سرب ہارا) ' اگر دیتھک بہے سیادل ' پور قدم چل بے چل ' (رکھیر)۔ 'چل چل چل' اور دھو گگنے بجے مادل۔ (سدھیا)، آگمنی (آگنی بینا) وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ یہاں آگمنی کے موحی للکار اور جھنکار لئے ہوئے چند الفاظ ملاحظہ ہوں ۔

اے کی　　رن با جہ بجے گھن گھن

جھن　　رن رن رن جھن جھن ،

تے کی　　دلکی دلکی

دھمکی دھمکی

داما دریمی دریمی گمکی گمکی

اوٹھے جوٹے جوٹے

چھوٹے چھوٹے چھوٹے

سہی پھنکی جمکی جمکی

ڈھال تلوارے کھن کھن !

اے کی　　رن باجے بجے گھن گھن

رن جھن جھن جھن رن رن !

مدلالاسلام صرف بغاوت و انقلاب کے شاعر نہیں۔ وہ حسن و عشق کے بھی شاعر ہیں۔ ان کا عشق اسی دنیا کا عشق ہے۔ شباب و بہار سے اس کا تعلق ہے۔ ان کے گیت ' مادھوی پرلاپ '، ' گورین پریا ' وغیرہ مادی عشق کے آئینہ دار ہیں۔ وہ شباب اور قوت کے شاعر ہیں۔ میدانِ عمل کی طرح میدانِ عشق میں بھی انہوں نے ایک قوی اور توانا عشق کا کردار پیش کیا۔

انہوں نے کہا ۔

کہہ دے ۔۔۔ عشق کسی کو کمزور نہیں بناتا ملکہ عظیم الشان بنا دیتا ہے ۔"

(سندھو، سندھو ہیدول)۔

وہ زندگی کے دوسرے پہلوؤں کی طرح عشق و عاشقی میں بھی خودداری اور عزتِ نفس کا احساس نہیں کھوتے، ان کے عشق میں پیار و محبت، غم و غصہ، چھیڑ چھاڑ سب کچھ موجود ہے ۔ ان کی محبت گہری ہے ۔ وہ اپنی محبوبہ کو پوری طرح اپنانا چاہتے ہیں ۔ اس میں کسی کی شرکت و رقابت گوارا نہیں کرتے ۔ جہاں محبوبہ ان کی محبت کی پاسداری نہیں کرتی اور انہیں اپنے عشق میں پوری کامیابی حاصل نہیں ہوتی، وہیں وہ اپنی محبوبہ سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگتے ہیں اور غم و غصے کا اظہار بھی کر جاتے ہیں ۔

آج تم اُس دن کی تم نہیں ہو ۔
اب میں دیکھ رہا ہوں ۔۔۔ کہ تم بھی مکار ہو ۔
تم بھی دغا و فریب سے فتحیاب ہونا چاہتی ہو ۔
کچھ تو مجھے دینا چاہتی ہو اور کچھ دوسرے کے لئے رکھ لیتی ہو ۔
اے بدقسمت! تمہارا یہ رویہ دیکھ کر مجھے انتہائی ہنسی آتی ہے ۔
تم کس کو دغا دینا چاہتی ہو ۔

شاعر اپنی نظم "بھیٹاپ" (بددعا) میں کڑے الفاظ میں اسے بددعا دیتے ہیں کہ تم آج میری نہیں ہو تو کل اس کے لئے تمہیں ضرور پچھتانا پڑے گا ۔

گہری رات کو جب تم خواب سے اچانک چونک اٹھو گی
تو تمہارا سینہ کسی ایک دیدہ و دانستہ صورت کے لئے دھڑک اٹھے گا ۔
تم خواب سے چونک اٹھو گی ۔
اور تمہیں یہ خیال ہو گا کہ میں ہی
تمہارے سینے سے لگا بیٹھا ہوں ۔
مگر جب چھونے کی کوشش کرو گی تو تمہیں معلوم ہو گا

کہ بچھونا خالی ہے ! خواب جھوٹا ہے !
اس وقت مارے درد کے آنسوؤں سے تمہاری آنکھیں ڈبڈبا جائیں گی -
اس دن تم سمجھوگی، ضرور سمجھوگی -

(ابھیتاپ، دولن چانپا)

نذرالاسلام کا عشق مافوق الفطرۃ نہیں - ان کے عشق کا تعلق عالمِ رنگ و بو سے ہے -
ان کی محبوبہ عالمِ خاکی کا ایک فرد ہے - دیوی نہیں - وہ اپنی محبوبہ کو لے کر اس دنیا کو جنت کا نمونہ
بنانا چاہتے ہیں -

میں تمہیں جنت کا ایک فرد قرار دینا نہیں چاہتا ہوں -
تمہارے قدموں پر جنت لاکر دنیا کو موہ لینا چاہتا ہوں -
تمہیں دیوی بنا کر پوجنے میں
مجھے کیا فائدہ ہے ؟
میں دیوی کا رحم نہیں چاہتا - میں اس پیار کے آنسوؤں کا طلبگار ہوں -
حسن کی ناز بھری آنکھیں معمولی درد سے بھی ڈبڈبا جاتی ہیں -

(اے مورا منہکار، چکرباک)

نذرالاسلام کے عشق میں ناز کے ساتھ نیاز بھی پایا جاتا ہے - غم و غصہ اور لعن طعن کے ساتھ
ساتھ تسلیم اور خودسپاری بھی پائی جاتی ہے - اسی میں ان کی عشقیہ شاعری کا کمال ہے - اس لئے
خودسپاری عشق کی جان ہے - جہادِ عشق میں شکست کھا جانا ہی اصلی کامیابی ہے - یہاں کامیابی
میں بھی آنکھیں ڈبڈبا جاتی ہیں - نذرالاسلام باغی ہوتے ہوئے بھی ہمیں سناتے ہیں -

اے میری رانی ! آج آخر تمہارے سامنے سر جھکا دیتا ہوں -
میری فتح و نصرت کا پھریرا تمہارے قدموں پر جھک رہا ہے -
میری فاتحِ جنگ اور لافانی تلوار
روز بروز بوجھل ہوتی گئی ہے - یہ مجھ پر گراں گذرتی جارہی ہے -

اس میں ایسا یہ نوحہ تمہاری محبت کے ذریعے رنج کرتا ہوں ۔

اپنی شکست کا یہ لوہا تمہاری زلف میں پہناتا ہوں ۔

(ر بجھنی ، تیھایاٹ)

جس شاعر نے کسی وقت کہا تھا ـــ میں کسی کے آگے سر نہیں جھکاتا"

آج اس کا سر محبوبہ کے قدموں پر جھک رہا ہے ۔ اس میں کوئی تضاد نہیں ۔ اس لئے کہ بغاوت ان کی پیدائش کے ساتھ نہیں آئی تھی باغی تو انہیں ماحول نے بنایا ۔ ورنہ محبوب کے آگے سر جھکانا ان کے لئے باعثِ ننگ کبھی نہیں رہا ۔

ہر تخلیق اور فن کاری کے پس منظر میں عشق کا جذبہ ضرور کار فرما ہوتا ہے ۔ عشق اور کمالِ شوق کے بغیر کوئی بڑا کارنامہ وجود میں نہیں آسکتا ۔ عشق ایک قوت اور ہمہ گیر فطری جذبہ کا نام ہے اس کا میدان اتنا ہی وسیع ہے جتنی کہ کائنات ۔ عام طور پر مجازی محبت اور شباب و بہار کے ساتھ اس کی ابتدا ہوتی ہے ۔ یہ ایک سیل ہے ۔ تعمیر و تخریب دونوں کا امکان رکھتا ہے ۔ اگر اس کا رُخ تعمیری کاموں کی طرف موڑ دیا جائے ، تو اس سے انسانی زندگی کے ہر شعبے میں شایانِ شان کارنامے انجام پا سکتے ہیں ۔ یہ قانونِ فطرت ہے کہ ہر فطری شاعر عاشق مزاج ہوتا ہے ۔ ہاں بعض میں یہ جذبہ شخصی دائرے میں محدود ہو کر رہ جاتا ہے ۔ اور بعض کے یہاں ہمہ گیر رنگ میں رنگ جاتا ہے نذرالاسلام بھی فطری شاعر اور فطری عاشق تھے ۔ انہوں نے خود اعتراف کیا ہے کہ میری تمام سرگرمیوں کا سرچشمہ عشق و محبت ہے ۔ میرے اس جذبے کے احترام میں آفتاب و ماہتاب اور زمین و آسمان میری طرف جھک رہے ہیں ۔ انہوں نے محبوبہ کو مخاطب کر کے کہا :-

تمہاری محبت نے مجھے شاعر بنا دیا ہے

میرا یہ روپ ـــ تمہاری محبت ہی کی تصویر ہے ۔

یہ آسمان یہ ہوا اور صبح کی یہ روشنی غرض

ہر چیز نے اپنا سمجھ کر میری طرف ہاتھ بڑھا دیا ہے ۔

مغرب کا ڈوبتا ہوا زہرہ

اور مشرق کا اُجلا آفتاب
سب ہی مجھے پیار کرتے ہیں۔
یہ اس لئے ہے کہ میں تمہاری نگاہوں میں محبوب ہوں۔

نذرالاسلام کی شخصی محبت عالمی محبت کے رنگ میں رنگ کر ایک نئے روپ میں ظاہر ہوئی۔ ان کے یہاں غم جاناں نے غم دوراں کا کام کیا اس وجہ سے ان میں ایک نئی بیداری اور نیا احساس پیدا ہوا۔ اسی احساس نے انہیں نئی زندگی کے گیت گانے پر اکسایا۔ فرماتے ہیں۔

میری امانت تمہاری محبت میں روپوش تھی
اب تمہارے غیر متوقع ظہور کے ساتھ ساتھ میری امیدیں بھی آئی ہیں۔
(کولی رانی، دولن چانیا)

میں مفلوک الحال قوم کو نئی زندگی کا ترانہ سناتا ہوں۔
اے پیاری! میری مست جوانی کی یہ تیز رفتاری تمہارا ہی احسان ہے۔
(آمارکوتیاتوی، سدھیا)

یوں تو نذرالاسلام نے اپنی عشقیہ نظموں اور گانوں میں سکھ دکھ، آس اور یاس ہر طرح کی قلبی واردات اور عاشقانہ جذبات کا اظہار کیا ہے مگر المیہ پہلو ہمیشہ غالب رہا ہے۔ انہیں تو وصال سے فراق ہی میں زیادہ لطف آتا ہے وہ انسانی محبت کے شاعر ہیں آنسوؤں کے شاعر ہیں۔ اس لئے المیہ پہلو خاص کر ہجر کے غم و اندوہ کے بیان میں زیادہ کامیاب نظر آتے ہیں۔ انہوں نے ہجر کی تمام کیفیتوں کو اپنی شاعری میں فنکارانہ طور پر بیان کیا ہے۔ اسی پہلو میں ہم نذرالاسلام کو اردو کا میرؔ کہہ سکتے ہیں۔

جب انسان مایوس کن ہجر میں مبتلا ہوتا ہے۔ تو اسے ساری دنیا درد فراق میں مبتلا نظر آتی ہے وہ فطرت کی ہر چیز کو ہجر کی نگاہوں سے دیکھتا ہے اور اس کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری کائنات بھی اس کے ساتھ آہ و فغاں میں گرفتار ہے۔ اس مضمون کو شاعر یوں بیان کرتے ہیں۔

اے فرقت زدہ محبوبہ! آج میرا درد، فرقت زدہ کائنات کی زبان پر
سیکڑوں گیتوں کا شرن کر تمہارے لئے تڑپ رہا ہے
تم دریا کے اس پار اور میں اس پار ملنے سے معذور!
تم آنسو بہاتی ہو اور میں پھول پیش کئے جاتا ہوں۔

المیہ گیتوں میں مسافر چھوڑے آنکھی جل ' یا تا پر بھٹکالے گھوم کے تمی سر پر چھولوائے ،
رتے ایلے پھول ہے پریو آج اسے سمادھی تے مورا' تا مل کر ہیں۔

سر زمین بنگال فطری حسن سے بھرپور ہے اس سے ہمارے دلی جذبات کا گہرا تعلق ہے ہمارے درد وصال، مسرت و مصیبت کے جذبات پر فطرت کا اثر پڑے بغیر نہیں رہ سکتا۔ فطری مناظر کے ربط سے ہمارے شعرا کے دل ایسے جذبات و خیالات کی تصویر کھینچتے رہتے ہیں۔ نذرالاسلام نے بھی فطرت کو عاشقانہ نگاہ سے دیکھا اور انہیں اس میں اپنی محبوبہ کا عکس نظر آیا۔ مثال کے طور پر ان کی نظم سندھو کو پیا جا سکتا ہے۔ اس نظم میں وہ سمندر کو اپنا ہمراز خیال کرتے ہیں ان کی نگاہ میں سمندر ہجر کے درد میں مبتلا ہے۔ وہ بھی باغی ہے اور اس کی بغاوت درد فراق کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ نذرالاسلام خود درد ہجر میں پھنسے ہوئے ہیں اور وہ خود باغی ہیں اس لئے انہیں اپنی ذات اور سمندر کی ذات میں یگانگت نظر آتی ہے۔ وہ سمندر کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں۔

اے سمندر!
ایک ہی صورت اور ایک ہی درد میں
تو بھی روتا ہے۔ میں بھی روتا ہوں اور میری محبوبہ بھی روتی ہے۔

یہ سمندر نذرالاسلام کی بغاوت و انقلاب، درد ہجر اور حسن و عظمت کا ترجمان ہے اس لئے وہ بصد احترام اسے سلام کرتے ہیں۔

اے عظمت والے! اے ازلی فرقت کے جھیلنے والے!
اے سمندر! اے میرے ہمدم، اے میرے باغی!
اے میرے حسین!

میرا سلام لینا !

کبھی کبھی نذرالاسلام کی محویت فطرت میں گھل مل جاتی ہے۔ اس لئے وہ اس سے ایسی محبت کا رشتہ جوڑتے ہیں۔ وہ درخت کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔

مجھے تیری پتیوں میں اس کی آنکھوں کے کاجل کا نقشہ نظر آتا ہے۔
اس کا قامت تیرے ہی جسم کے مانند دراز ہے۔
تیری جھر جھر بھر بھر کی آواز اس کی دبی آواز ہے
تیری ہی شاخ پر اس کی ساڑی کا آنچل آویزاں ہے

نذرالاسلام کی بعض عشقیہ نظمیں اور گانے جو سیاسی ماحول یا شاعری کے ابتدائی دور میں لکھے گئے، ان میں مادیت کی کارفرمائی اور گہرائی کی کمی نظر آتی ہے۔ مگر آخری دور میں جو گیت اور نغمے ان کے قلم سے نکلے، ان میں شاعرانہ کمال نظر آتا ہے۔ رومانیت، ہمہ گیری، روحانیت اور وارفتگی ان تخلیقات کی خصوصیات ہیں۔

نذرالاسلام کے عشق کا آغاز مادی عشق سے ہوتا ہے۔ مگر وہ شخصی اور محدود عشق سے گذر کر ہمہ گیر محبت اور حقیقی عشق تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ وہ جام سے شراب پینا تو چاہتے ہیں مگر جام کو فقط ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اور شراب ہی کو مقصود بالذات قرار دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ مادیت کے توسط سے روحانیت حاصل کرنے کے خواہشمند ہیں۔ وہ مختلف ذرائع سے ازلی عشق حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے خیال میں ہر محبت، چاہے وہ انسان سے ہو یا فطرت سے، اس میں ازلی محبت کا ہمہ گیر جلوہ ضرور کارفرما ہوتا ہے۔ شراب کا ظرف اگرچہ مقصود بالذات نہیں تاہم اس کا اثر شراب پر ضرور پڑتا ہے۔ اسی لئے وہ کثرت سے وحدت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ہر حسن کا لطف اس لئے اٹھاتے ہیں کہ اس کے پردے میں انہیں حسن ازل کا پرتو نظر آتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

ہر وہ چیز جس کا حسن دیکھ کر میں نے بوسہ دیا ہے،
ہر وہ چیز جس کو بوسہ دے کر میں نے حسین بنا دیا ہے،

ان سب میں تیرا ہی جلوہ محسوس کیا ہے۔
محبت ایک حقیقت ہے مگر وہ جن چیزوں میں بستی ہے وہ متعدد ۔ بیشمار ہیں
یہی وجہ ہے کہ ـــــ اسے چاہتا ہوں تو دل سے محسوس بھی کرتا ہوں پھر بھی
نہ جانے کیوں دل روتا ہے ۔
شراب ایک حقیقت ہے مگر اس کا ظرف حقیقت نہیں ۔
تاہم جس ظرف میں پیو ، اس کا نشہ ضرور ہوگا ۔
اے میری ازلی رفیقہ ـــــ !
لطف ہے کہ اتنے دنوں کے بعد میں نے تجھے پہچان لیا ہے
تو میری محبت کے اندر ہی روپوش ہے ۔
مضوں میں تجھے ڈھونڈتا ہوں اور زندگی بھر روتا ہوں ۔
ہر رنگ روپ میں تو موجود ہے اور مجھے مل رہی ہے ۔
تجھے میں نے پہچان لیا ہے ۔
میں جس سے بھی محبت کروں ، وہ تو ہی ہے ۔
وہیں تو مل سکتی ہے ۔
محبت ایک ہے مگر محبوب بہت ہیں ۔
مختلف ظرفوں میں محبت کی رنگین شراب پیوں گا
اے بے نام محبوبہ ! تجھے فرطِ اشتیاق سے مزے لے لے کر پیوں گا
کبھی صراحی میں پیوں گا تو کبھی شیشے میں اور کبھی اسے پیالے میں
نوشِ جان کروں گا ۔

(انامیکا ، سندھو ہندول)

آرکتونی " کے عنوان سے شاعر کی ایک نظم ہے ۔ وہاں انہوں نے صاف کہا کہ ان کی شراب
شراب الودود" یعنی عشق الٰہی ہے :۔

اے ساقی! جب تو نے میرا ذہن خراب ہی کر دیا تو شراب دے ۔
"الودود" کی شراب کا دور مسلسل چلنے دے ۔

نذر الاسلام کی نظم "پتھ چاری" (راہی) کی آخری چند سطریں ملاحظہ ہوں ۔ یہاں شاعر کا عشق، عشقِ الٰہی کے بحرِ لامتناہی سے ملنا چاہتا ہے ۔ وہ رواں رواں ندی کو اپنا ہمراہ اور ہمراز خیال کرتے ہیں ۔ اس کی زباں میں اپنے خیال کی ترجمانی کرتے ہیں اور زبانِ حال میں کہتے ہیں ـــــ اے ندی! تو بھی منزل کی جویا ہے اور میں بھی منزل کا جویا ہوں ۔ تو فرازِ کوہ سے اپنے درد بھرے آنسوؤں کو لے کر تیری کے ساتھ سمندر سے ملنے جا رہی ہے کم گہرے پانی کی کثافت سے دور ہٹ کر عمیق سمندر کے صاف وشفاف پانی سے لطافت حاصل کرنا چاہتی ہے ۔ آگے چل ـــ میرے ہی ساتھ چل ہماری منزل ہمارا انتظار کر رہی ہے ۔

ندی اپنے سیلاب کے پانی سے یوں مخاطب ہے :-

اے سیلاب کے پانی! تو قل قل کرتا ہوا آگے بڑھتا جا ۔ آگے بڑھتا جا !
یہاں گدلا پانی تجھے ہمیشہ میلا کچیلا سا رہا ہے ۔
یہاں تجھے اشکِ شور کہاں ملیں گے ؟ اے راہی! چل ـــ آگے چل ۔
سات سمندروں کا نمکین پانی تیرا انتظار کر رہا ہے ۔

(پتھ چاری ، چکر باک)

نذر الاسلام کی نظم "آخری التجا" (دوبن جاتیا) میں یہ حقیقت اور زیادہ واضح ہو گئی ہے کہ وہ عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی تک پہنچنا چاہتے ہیں ۔ وہ اس بات کے متمنی ہیں کہ اس عالمِ ناسوت ہی میں عشق کے تمام مناقشات ، درد والم ۔ مایوسی اور نا امیدی کا خاتمہ ہو جائے اور آنے والی نئی زندگی میں انہیں ایک فرخندہ اور جاودانی وصال نصیب ہو ۔ اس عالمِ فانی کا ادھورا وصال تکمیل کو پہنچے ۔ اس دنیا کا خود غرضانہ درد والم آنسوؤں سے پاک صاف ہو جائے اور یہ آنے والی زندگی کے لئے ایک مکمل اور دائمی وصال کا موجب بنے ۔

رخصت کے وقت شاعر نذر الاسلام اپنی محبوبہ سے ان الفاظ میں خطاب کرتے ہیں ۔

یوں تو میری ساری زندگی تیری محبت میں گذر گئی ۔
آج آخری وقت پُرنم آنکھیں لے کر میں یہ التجا کرتا ہوں ۔
کہ اس پُر اندوہ رخصت کے وقت
تیرا یہ پیار، یہ تغافل،
یہ ناز و غمزہ، یہ کھیل
آنے والی نئی زندگی میں ہنسی خوشی کے ساتھ
اس دنیا کے ادھورے وصال کے لئے تکمیل کا موجب ملے ۔

(آخری التجا ۔ دولن چاپا)

یہ عشق کے وہ منازل ہیں جہاں نذر الاسلام حسن ازلی اور محبوب حقیقی کے جویا نظر آتے ہیں ۔ مگر ان کے آخری دور کی والہانہ نظمیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ انہیں اپنی مطلوبہ حقیقت مل گئی ہے اور وہ الوہی عشق کی شراب سے سرشار ہیں ۔ فرماتے ہیں ۔

عشقِ الٰہی کی شراب پی کر
میں مدہوش پڑا رہتا ہوں
مسجد (ظاہری شریعت) سے گذر کر
اس مسلکِ عشق سے میرا مرشد
اپنے رتبے پر پہنچا ہے ۔

نذر الاسلام کے عشقیہ سنگیت پر عمر خیام اور حافظ کا کافی اثر نظر آتا ہے ۔ اس کی ایک وجہ بھی ہے ۔ وہ یہ کہ فوجی زندگی میں کراچی کے دورانِ قیام میں انہوں نے عمر خیام اور حافظ کی شاعری کا گہرا مطالعہ کیا تھا ۔ ان کا رباعیاتِ حافظ اور رباعیاتِ عمر خیام کا بنگلہ ترجمہ اسی تاثر کا نتیجہ ہے ۔ ان دونوں کی طرح نذر الاسلام کی عشقیہ شاعری میں بھی حسن کی نغمہ سرائی، جوانی کی مستی، جسمانی لذت اور لطف اندوزی کا بیان بہ کثرت نظر آتا ہے تینوں کی شاعری میں بھی شباب و بہار، شراب و ساقی اور کیف و سرور کے نظارے ملتے ہیں ۔

عمر خیّام :-

روزے کہ گذشتہ است، ازو یاد مکن
فردا کہ نیامدہ است، فریاد مکن
برنامدہ و گذشتہ بنیاد مکن
حالے خوش باش و عمر برباد مکن

دورانِ جہاں بے مئی و ساقی، ہیچ است
بے زمزمۂ نائے عراقی خوش نیست
ہر چند در احوال جہاں می نگرم
حاصل ہمہ عشرتست و باقی خوش نیست

حافظ

بیا تا گل برافشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرح نو در اندازیم
اگر غم لشکر انگیزد کہ خونِ عاشقان ریزد
من و ساقی بہم سازیم و بنیادش براندازیم

ساقی بہ نورِ بادہ برافروز جامِ ما
مطرب بگو کہ کارِ جہاں شد بکامِ ما
ما در پیالہ عکسِ رخِ یار دیدہ ایم
اے بے خبر ز لذتِ شربِ مدامِ ما

مرزا اسلام :-

ترجمہ اسی نمبر میں ملاحظہ ہو۔

بایں ہمہ اشتراک، زندگی کی بقا اور زوال کے موضوع پر مندرالاسلام، حافظ اور عمر خیام سے الگ ہو جاتے ہیں۔ عمر خیام اور حافظ زندگی کی بے ثباتی، خوش عیشی اور لطف اندوزی کی تعلیم دیتے ہیں۔

عمر خیام:

در باب کہ از روح جدا خواہی رفت
در پردۂ اسرار فنا خواہی رفت
مے نوش، ندانی از کجا آمدۂ
خوش باش، ندانی کہ کجا خواہی رفت

اے بیخبر ایں شکل مجسم ہیچ است
ویں طارم نو سپہر ارقم ہیچ است
خوش باش کہ در نشیمن کون و فساد
وابستۂ یک دمیم وآں ہم ہیچ است

حافظ:

حاصل کارگہِ کون و مکاں ایں ہمہ نیست
بادہ پیش آر کہ اسبابِ جہاں ایں ہمہ نیست
غمِ دنیائے دنی چند خوری، بادہ بخور
حیف باشد دل دانا کہ مشوش باشد
خوش ترا ز فکر مے وجام چہ خواہد بودن
چوں خبر نیست کہ انجام چہ خواہد بودن

نذرالاسلام کا فلسفۂ زندگی ان دونوں سے مختلف ہے۔ غالب، حافظ اور عمر خیام زندگی کی پائیداری کے قائل نہیں۔ وہ اس حیاتِ دنیا کو آنی و فانی اور خواب و خیال سمجھتے ہیں۔ مگر ٹیگور، اقبال اور نذرالاسلام زندگی کو پائدار خیال کرتے ہیں۔ وہ موت کو تجدید مذاق زندگی سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ موت دراصل روح کی فنا کا نام نہیں ہے۔ بلکہ زندگی کی کیفیت میں ایک خاص تبدیلی کا نام ہے۔ حیات ایک دھارا ہے جو ہمیشہ بہتا رہتا ہے۔ یہاں روح کو ترقی دینے کا جو کام باقی رہے گا اسے موت کے بعد کی زندگی میں پورا کیا جائے گا۔ ترقی کی رفتار میں کبھی وقفہ نہ ہوگا۔ حیاتِ دنیوی کا رشتہ حیات اخروی کے دھاگے کے ساتھ ضرور منسلک ہے۔ بالفاظ دیگر موت وہ دروازہ ہے جس سے گذر کر ہم زندگی کی دوسری اور بلند تر منزل میں داخل ہوتے ہیں۔ اسی لئے نذرالاسلام موت سے ہراساں نہیں وہ نوجوان بہادروں کو اپنے ملک کی تزئین و آرائش کے لئے آغوش مادر چھوڑ کر میدانِ جنگ میں اتر جانے کی دعوت دیتے ہیں اور زندگی کی بلند تر منزل میں گامزن ہونے کی ترغیب دیتے ہیں۔

فرماتے ہیں۔

موت زندگی کا خاتمہ ہرگز نہیں۔
سناؤ! ضرور سناؤ!
غیر متناہی زندگی کا دھارا ہمیشہ سے بہہ رہا ہے
نمری اور جوانی کے نشہ میں سرشار آدمیوں
کو ماں کی محبت بھری آغوش چھوڑ کر باہر آنے دو۔
بہادر اولادوں کو
اپنی خاک وطن کو سجانے بسانے دو۔

(آخری سوغات)

نذرالاسلام کے یہ الفاظ گویا اقبال کے فلسفۂ زندگی کی صدائے بازگشت ہیں۔ زندگی کی پائیداری کے متعلق اقبال فرماتے ہیں۔

موت تجدید مذاق زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

جوہر انسان عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے، فنا ہوتا نہیں

عشقیہ سنگیتوں میں تعمق فکر کے لحاظ سے بنگلہ ادب میں ٹیگور لاثانی ہیں۔ ان میں روحانی عشق و محبت کی گہرائی اور عالمگیر خیالات کی وہ فراوانی ملتی ہے جو نذرالاسلام کے بس کی بات نہیں۔ مگر نذرالاسلام نے عام لوگوں کے جذبات، ان کی عشق و محبت کی واردات اور وصال و فراق کی داستانوں کو ایسے سیدھے سادے اور دلکش انداز میں بیان کیا ہے کہ ہر پڑھنے والا یا سننے والا یہی سمجھتا ہے کہ یہ میرے دل کی باتیں ہیں۔ اس لئے ان کے گانوں کو وہ ہر دلعزیزی حاصل ہوئی جو ٹیگور کے گیتوں کو نصیب نہیں ہوئی۔ نذرالاسلام کے عاشقانہ گانوں میں "بھائی لباسے باندھیو باسا" (محبت سے گھر باندھوں گا)۔ "دیتے ایلے پھول ہے پریو" (پیارے تو پھول چڑھانے آیا ہے)، "پرسیا ہوئے الیو رانی" (آجا رانی! تو پیاری بنی ہے گی)، "ساون ایلو پھیرے" (ساون لوٹ آیا ہے)، "آمائے ہینے گو، بھال باسو مور گان" (تو میرے گیت سے محبت رکھتی ہے مجھ سے نہیں)، "ساون راتے جدی شرنے آسے مولے" (اگر میں ساون کی رات یاد آؤں) "کین آنو پھول ڈور" (گل دستہ کیوں لاتی ہو؟) بنگلہ ادب کے مایۂ ناز شاہپارے ہیں۔

نذرالاسلام کے سنگیت میں ان کی غزلوں کو بہترین تخلیقات خیال کیا جاتا ہے۔ اسی صنف میں ان کی رومانی اور رغنائی شاعری کی معراج ہوئی ہے۔ اسی میں ان کے فنکارانہ کمال کا مکمل ظہور ہوا ہے۔ مغلیہ حکومت کے زمانے سے بنگلہ ادب میں غزلیں لکھی تو جاتی تھیں مگر وہ فارسی غزلوں کے رنگ روپ میں ہوتی تھیں۔ ان میں مقامی رنگ کا فقدان تھا۔ نذرالاسلام سے اتل پرشاد نے بھی بنگلہ غزلیں لکھیں مگر وہ اردو غزلوں کی ہوبہو نقالی سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ ہاں نذرالاسلام نے غزل گوئی میں بنگلہ ادب کا مزاج ملحوظ رکھا۔ ان کی غزلوں پر حافظ کا گہرا

اثر نظر آتا ہے۔ انہوں نے خواجہ حافظ، اور مولانا رومی وغیرہ کی فارسی غزلوں اور خیام کی رباعیوں کا براہ راست مطالعہ کیا اور ان سے اثر لے کر بنگلہ غزلیں لکھیں۔ ایرانی سروں کو بنگلہ سنگیت کے سانچوں میں ڈھالا اور ان میں مقامی رنگ پیدا کیا۔ انہیں مقامی ذوق کے مطابق بنایا۔ اسی صنف شاعری میں انہوں نے نئے نئے سُروں کو تجربہ کیا۔ گم شدہ سروں کو ماہرین فن سے حاصل کیا اور اسی صنف کے توسط سے انہیں دوبارہ زندہ کیا۔ دیسی اور بدیسی راگ راگنیوں کی آمیزش سے بنگلہ سنگیت میں ایک حیرت انگیز تنوع پیدا کیا۔ ان کی کتاب "بلبل" اس سلسلے میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

یوں تو نذر الاسلام نے کم و بیش ہر جگہ عربی و فارسی الفاظ کا استعمال کیا ہے مگر غزلوں میں انہیں ایسے فنکارانہ کمال کے ساتھ استعمال کیا کہ ان کا طرزِ نگارش قدیم پوتھی ادب کے اسلوبِ بیاں سے بہت قریب پہنچ گیا ہے اور اس سے ان کے کلام کی لطافت اور دلچسپی میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ سنگیت کے میدان میں نذر الاسلام کو جو مقبولیت حاصل ہوئی ہے وہ بڑی حد تک ان کی غزلیہ گانوں کا صدقہ ہے۔ عشقیہ شاعری میں "بلبل" اور "چوکھیر چاتک" ان کی بہترین کتابیں ہیں۔ غزلیہ گانوں میں "ماعیچائے ملبلی توئی، پھول شاکھاتے دِس رے آجی دول" (تو باغ کی بلبل ہے، پھول کی شاخوں میں آج لہر پیدا نہ کر)، "کے بدیسی بن اداسی بانیہ بانسی بجاؤ رے" (تو کون پردیسی بن میں متوالا ہے اور بانس کی بانسری بجا رہا ہے)، "کین آنو پھول ڈور آجی اے بدائے بیلائے" (آج رخصت کے وقت گلدستہ کیوں لاتی ہو)، "لینئی بھور ہول جاگیا پراں پیا، (اے جانِ جاں! جاگتے ہوئے میں نے رات کاٹی) کے۔ اد بھولے نا کے۔ اد بھولے (بعض نہیں بھولتے ہیں اور بعض بھول جاتے ہیں)، "کروں کین ارون آنکھی" (سرخ آنکھیں کیوں پرنم ہیں) وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

نذر الاسلام نے شیام سنگیت بھی گائے اور وشنو سنگیت بھی۔ شیام سنگیت میں رام پرشاد کے بعد ہی ان کا درجہ خیال کیا جاتا ہے۔ وشنو سنگیت میں ان کا درجہ بلند نہ ہو تو قابلِ ذکر ضرور ہے۔

نذرالاسلام نے اسلامی سنگیت کو رواج دے کر سرزمین بنگال کے مسلمانوں کا دل موہ لیا۔ انہوں نے انقلابی نظموں سے بنگال میں گھر گھر آزادی کی لہر دوڑائی اور اسلامی سنگیت سے مسلمانوں میں مذہبی جوش و جذبہ ابھار کر انہیں قعرِ مذلت سے نکالنے کی کوشش کی۔ انہیں اپنے شاندار ماضی کی یاد دلا کر ہمت و حوصلہ اور غیرت و حمیت سے کام لینے پر آمادہ ہے۔ موسیقار عباس الدین (سنہ ۱۹۰۱ء ۔ سنہ ۱۹۵۷ء) نے ان کے اسلامی سگیتوں اور غزلوں کو گا گا کر ہر دلعزیز بنایا۔ یہ اسلامی غزلیں مسلمانوں کی روزمرہ زندگی کے واقعات، تہذیب و تمدن، رسوم و روایات اور مذہبی عقائد کی آئینہ دار ہیں۔ اس اسلامی ادب کی بدولت نذرالاسلام مذہبی حلقوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ جن لوگوں نے کسی وقت ان پر کفر کا فتویٰ لگایا تھا۔ وہی لوگ ان کے اسلامی ادب سے متاثر ہو کر پھر ان کے گرویدہ ہو گئے ان کا شیام سگیت کسی مسلمان پر گراں گذرتا ہو، تو ان کی عقیدتمندانہ اور نیازمندانہ غزلیں اسے مرور اں کا گرویدہ سا لیتی ہیں۔ بے جان سے بے جان آدمی کے سامنے بھی یہ غزلیں لے بھری آواز میں پڑھی جائیں، تو اس کا دل پھڑک اٹھے گا۔ اس میں ایمانی جوش و جذبہ ابھر آئے گا۔ آج بھی اکثر میلاد کی محفلوں میں ان کے قصائد پڑھے جاتے ہیں۔ جن کو سنکر لوگ جھوم اٹھتے ہیں بے ساختہ ان کی زبانوں سے واہ وا نکل جاتی ہے اور دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔

نذرالاسلام کے قلم سے حمد، نعت، مرثیہ، غرض مختلف قسم کے اسلامی سنگیت نکلے ہیں۔ ان میں بعض شاہ پارے ایسے ہیں کہ دنیا کی اور زبانوں میں ان کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ اس سے پہلے بھی مسلمان شاعروں نے اسلامی گانے لکھے تھے مگر اس کا بیشتر حصہ زبان و بیان کے لحاظ سے اعلیٰ ادبی معیار سے گرا ہوا تھا۔ اس لئے وہ گانے تعلیم یافتہ حلقوں میں مقبول نہ ہو سکے۔ نذرالاسلام نے اسلامی گیتوں اور غزلوں کو ایسی آسان اور دلکش زبان میں پیش کیا کہ عوام و خواص سب ہی اس سے محظوظ ہو سکتے ہیں۔ ان کا اسلامی سگیت اس بات کا ثبوت ہے کہ مذہبی جذبات کے ذریعہ ایک پسماندہ قوم میں کس طرح زندگی کی روح پھونکی جا سکتی ہے۔

نذرالاسلام کے اسلامی گانوں کی تعداد دو سو کے قریب بتائی جاتی ہے۔ یہ اسلامی ادب

کا ایک بیش بہا ذخیرہ ہے۔ بنگلہ ادب اس پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ بنگال کے کئی شاعروں پر نذر الاسلام کے اسلامی ادب کا نمایاں اثر نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں غلام مصطفیٰ، فرخ احمد مفخر الاسلام، میزان الرحمٰن، ڈاکٹر شہید اللہ، قاضی مطہر حسین وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

نذر الاسلام کے اسلامی گانوں کے دو ایک نمونے قارئین کی لطف اندوزی کے لئے پیش کئے جاتے ہیں۔

عشقِ الٰہی

لغت:- عشقِ الٰہی کی شراب پی کر
میں مدہوش پڑا رہتا ہوں
مسجد سے گذر کر اس مسلکِ عشق سے
میرا مرشد اپنے رُتبے پر پہنچا ہے۔

میں روز روز کی مناجات میں یہ نہیں چاہتا
کہ اس حیاتِ دنیوی کے بعد
روزوں اور نمازوں کے بدلے
مجھے بہشت ملے

جس طرح قیس لیلےٰ کی خاطر
مجنوں ہو گیا تھا۔
جس طرح شیریں کی محبت میں

ظاہری شریعت سے آگے عشق اور معرفت کی بدولت میرے سرکارِ دوعالم فائز المرام ہوئے۔

فرہاد دیوانہ اور بے تاب تھا
اسی طرح میں۔ اپنے خدا ہی کے عشق میں
بے خود اور سرشار ہوں۔

پروانہ خوف سوزش سے لاپرواہ ہو کر
بے خطر آگ میں کود پڑتا ہے
سمندر کا پانی چاتک[*] کی پیاس ہرگز نہیں بجھا سکتا ہے!
وہ مینہ کے قطروں کے لئے ترستا رہتا ہے۔
چکور چاند کا عاشق ہوتا ہے۔
مگر چاند آسمان پر کہیں دور ہے۔
سورج کتنی دور ہے۔
مگر سورج مکھی اسی کا طالب ہے۔
اسی طرح میں بھی بے فکر و نڈر
خدا کا مشتاق ہوں۔

(ذوالفقار)

محرم کا چاند

مرثیہ:۔

پھر محرم کا چاند رلانے کو آگیا ہے۔
"واحسینؑ واحسینؑ" کا ماتم سنائی دے رہا ہے

---

[*] چاتک ایک پرندہ ہے جسکی پیاس پانی سے نہیں بجھتی۔ وہ آسمان کی طرف نگاہ اٹھائے بادل کا منتظر رہتا ہے۔

کربلا میں زین العابدین رو رو کر بیہوش پڑا ہوا ہے۔
بہشت میں علیؓ اور فاطمہؓ زار و قطار رو رہے ہیں۔
آج بھی زمین و آسمان بلکہ کل مخلوقات کے رونے کی آواز سنائی دے رہی ہے۔
سوگوار صحرا میں ابر سے خون کے آنسو ٹپک رہے ہیں۔
قاسم کی نعش پر بیوی سکینہ رو رہی ہے۔
اصغر کے ننھے سینے میں تیر دیکھ کر خود خدا رو رہا ہے۔
آج دنیا کے تمام مسلمان رو رہے ہیں۔ اور ان کا مرثیہ پڑھ رہے ہیں۔
انہیں کے سوگ میں ہزار سال سے آنسو بہا رہے ہیں۔
(ذوالفقار)

رمضان کے روزوں کے بعد

اے دل! رمضان کے روزوں کے بعد
خوشی کی عید آگئی ہے۔
تو آج اپنے آپ کو وقف کر دے۔
سُن! اس پر آسمان سے تاکید آگئی ہے۔

طلائی زیورات، شاندار محل سب کچھ
راہِ خدا میں دے دے!
مردہ مسلمانوں میں جذبۂ بیداری پیدا کرنے کے لیے
تو آج صدقہ و خیرات کر۔

اے میرے دل! تو اس عید گاہ میں

نمازِ عید پڑھ
جس میدان میں مجاہدانِ اسلام
جامِ شہادت پی چکے ہیں۔

آج دوست و دشمن کے فرق کو بھول کر
ہاتھ سے ہاتھ ملا۔
تاکہ تیری محبت دیکھ کر ساری دنیا
اسلام کی گرویدہ ہو جائے۔

جو لوگ زندگی بھر روزے رکھتے ہیں۔
اور ہمیشہ فاقہ کشی کرتے ہیں،
تو ان غریبوں اور مسکینوں کو
توفیق بھر عطا کر۔

تو اپنے دل کی طشتری میں
توحید کی شیرینی ڈال
امید ہے کہ حضرت محمدؐ
تیری دعوت کو قبول کریں گے۔

زندگی بھر جو پتھر تجھ پر
برسائے گئے،
تو انہیں اٹھا لے

اور انھیں سے محبت کی مسجد تعمیر کرے !

(ذوالفقار)

نامِ محمدؐ

نامِ محمدؐ کا ورد جس قدر کرتا ہوں اسی قدر لذت اور بھی
بڑھ جاتی ہے۔
کون جانتا تھا کہ اس نام میں اتنی لذت ہے
اس نام کے شہد کی چاہت میں
من کا بھونرا نغمہ سرائی کئے جاتا ہے۔
اس نام کے وفورِ شوق سے
مجھے بھوک اور پیاس کا احساس تک نہیں۔

وہ میرا عزیز ترین نام ہے
اسے مجنوں کی طرح ہمیشہ جپتا ہوں
اس نام کا پپیہا میری روح
کے گلزار میں گائے جاتا ہے۔

اس نام کا مسافر
تخت اور شاہنشاہی نہیں چاہتا۔
یا الٰہی ! ہمیشہ وہ نام
مجھے یاد آئے

انھوں نے ایک طرف مزاحیہ گانے مثلاً "جدی"، "تکیہ بر تقو"، "ہمتے بپریت" لکھ کر ہمیں دل بہلانے اور صرف دل بہلانے کا بہتیرا سامان پیش کیا تو دوسری طرف کافی تعداد میں طنزیہ گیتوں کی تخلیق سے سماج کی بدعنوانی، عیاری اور مکاری کی بھی قلعی کھولی ہے۔ "توبہ"، "پیکٹ"، "سرابیل"، "لیگ آف نیشن"۔ "راؤنڈ ٹیبل کانفرنس"، "سائمن کمیشن رپورٹ" جیسی نظمیں لکھ کر قومی اور بین الاقوامی سیاست و حکمت کی چالبازیوں اور حیلہ گریوں کا پول کھولا ہے۔ مزاحیہ نظموں میں دجیندر لال کے بعد ہی نذر الاسلام کا نام لیا جا سکتا ہے۔

مختصر لفظوں میں نذر الاسلام بنگلہ سنگیت کے بادشاہ ہیں۔ انہی کی بدولت وہ سنگیت کی تاریخ میں زندہ جاوید ہو کر رہیں گے۔

نذرالاسلام کی شاعری میں اسلام کا روپ

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

(اقبال)

"دنیا میں پھر اسلامی فرمان جاری ہوگا" (نذرل)

نذرالاسلام ایک صوفی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد صوفی منش آدمی تھے۔ مذہبی جوش اور روحانی عقیدت انہیں ورثے میں ملی۔ ابتدائی عمر میں انہوں نے عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ دینی مسائل شوق سے پڑھے۔ عرصے تک باقاعدہ مسجد کی خدمت کی۔ مؤذنی بھی کی اور امامت بھی۔ مذہبی ماحول میں رہ کر ان کی مذہبی عقیدتیں پختہ ہوگئیں۔ مزید براں فوجی زندگی میں انہوں نے پنجاب کے ایک مولوی صاحب سے حافظ شیرازی، مولانا روم اور دوسرے شعراے فارسی کا کلام بھی پڑھا اس سے ان کی مذہبی عقیدت اور زیادہ راسخ ہوگئی۔ مذہب اسلام کی آفاقیت اور ہمہ گیری کی خوبیاں ان پر واضح ہوگئیں۔

نذرالاسلام کو اپنی زندگی میں نشیب و فراز سے گذرنا پڑا۔ اس لئے فطری طور پر انہیں مظلوم انسانیت سے ہمدردی تھی۔ ان کی شاعری قول باری تعالیٰ "وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ" (اور بے شک ہم نے بنی آدم کو مکرم بنایا ہے) کی صدائے بازگشت تھی وہ عالمگیر انسانیت کا دل سے احترام کرتے تھے۔ کچلی ہوئی انسانیت کی نجات کے خواہاں تھے اور اسی لئے انہوں نے اپنی شاعری کو وقف کر رکھا تھا۔ وہ بیدار مغز، ذہین اور وسیع النظر تھے۔ انہوں نے مختلف مذاہب کا تقابلی مطالعہ کر کے دیکھا کہ دنیا میں تنہا اسلام ہی عالمگیر

انسانی تحریک ہے۔ اسی تحریک کے توسط سے انسانیت کا بول بالا ہوسکتا ہے۔ یہ واحد مذہب ہے جو بطریق اکمل توحید، آزادی، مساوات، دلیری، حق پرستی، انصاف اور امن وامان کا سبق سکھاتا ہے۔ یہ دنیا کے تمام انسانوں سے کہتا ہے کہ تم سب ایک ہی ماں اور ایک ہی باپ کی اولاد ہو۔ لہذا ایک دوسرے کے بھائی ہو اور انسان ہونے کی حیثیت سے برابر ہو۔ پیغمبر اسلام کا ارشاد ہے۔

" وہ شخص ایمان نہیں رکھتا۔ جو خود پیٹ بھر کھاتا ہے اور اس کا ہمسایہ اس کے پہلو میں بھوکا رہتا ہے "

دوسری جگہ آپ کا ارشاد ہے

آپس میں بدگمانی نہ کرو۔ ایک دوسرے کے معاملات کا تجسس نہ کرو ایک کے خلاف دوسرے کو نہ اکساؤ آپس کے حسد اور بغض سے بچو۔ ایک دوسرے کی کاٹ میں نہ پڑو۔ اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن کر رہو۔

ان تعلیمات کے پیش نظر سرزمین بنگال کے شاعرِ اعظم نذرالاسلام نے مذہب اسلام ہی کو اپنا منزلِ مقصود تک پہنچنے کا زینہ قرار دیا اور مختلف پیرایوں میں اپنی شاعرانہ زندگی کی ہر منزل میں اسلامی اصول اور اسلامی نظریات کی ترجمانی کی۔ مسلمان نوجوانوں میں انقلابی جوش وجذبہ پیدا کرکے ان کے ذریعے ایک نئی دنیا آباد کرنے کا منصوبہ پیش کیا۔ اسلامی نظام جاری کرکے دنیا بھر میں امن وامان قائم کرنا چاہا۔

نذرالاسلام نے پرنسپل ابراہیم صاحب کے ایک خط کا جواب (۱۹۲۷ء) دیتے ہوئے لکھا :-

" عوامی قوت، جمہوریت، ہمہ گیر برادری اور نظریۂ مساوات اسلام کی جان ہے۔ اسلام کی اس جدّت وعظمت کا میں تو اعتراف کرتا ہوں، جو اہلِ اسلام نہیں ہیں، وہ بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ اسلام کی ان صداقتوں کو مرکز قرار دیکر ادب کیوں، ادَب عالیہ کی بھی تخلیق کی جاسکتی ہے۔ میں

ایک ادنیٰ شاعر ہوں۔ میں نے اپنی بہت سی نگارشات میں اسلام کی اس عظمت
کا گیت گایا ہے
میں جانتا ہوں کہ بنگالی مسلمانوں کو ترقی یافتہ بنانے میں ملک کی سب سے
بڑی فلاح مضمر ہے۔ ان میں احساس نفس نہیں۔ اسی لئے آج ہندوستان
کی آزادی کا راستہ بند ہے۔"

(جوگ سرشٹا نذرل)

اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ نذرالاسلام کی شاعری صرف مسلمانوں کے لئے ہے اور
کسی کے لئے نہیں۔ کسی نبی اور رسول نے بھی یہ بات نہیں کہی کہ میں مسلمانوں کے لئے ہوں یا ہندوؤں
کے لئے۔ عیسائیوں کے لئے ہوں یا یہودیوں کے لئے نہ ہندوؤں کے لئے بلکہ پوری انسانیت
کے لئے ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی راہ عمل کیا ہے؟ انہوں نے اسلامی اصولوں کی ترجمانی
اس لئے نہیں کی کہ وہ مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے ہیں اور نہ اس لئے کہ وہ مذہب اسلام کے
کورانہ مقلد ہیں بلکہ اس لئے کہ انہیں اسلامی تحریک سے بہتر کوئی دوسری انسانی تحریک نظر
نہیں آئی۔

اس میں شک نہیں کہ دنیا کے تمام مذاہب میں توحید کی تعلیم کم و بیش پائی جاتی ہے۔
مگر خالص اور بے لوث توحید کی تعلیم اسلام کے سوا کسی اور مذہب میں نہیں ملتی۔ ہندو
دیوتاؤں اور دیویوں کے قائل ہیں۔ وہ اینٹ، پتھر، آگ، پانی وغیرہ کے سامنے گردن جھکاتے
ہیں۔ اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی مورتوں کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھتے ہیں۔ عیسائی،
نظریۂ تثلیث سے خدا کی ذات میں شرک کرتے ہیں۔ غرض ہر مذہب میں کم و بیش شرک
فی الذات، شرک فی الصفات اور شرک فی العبادۃ کی تعلیم موجود ہے مگر اسلام واحد مذہب
ہے جو صحیح اور مکمل توحید کی تعلیم دیتا ہے اسلام کی نگاہ میں وہی مومن کامل ہے جو
اللہ کے سوا کسی کے آگے سر نہیں جھکاتا ہے۔ وہ خدا ہی سے مدد مانگتا ہے۔ اور کسی سے
نہیں۔ نذرالاسلام نے اپنی شاعری میں اسی حقیقت کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا کہ مسلمان

توحید کے اس جذبے سے سرشار ہو سکیں، تو ساری دنیا ان سے مرعوب ہو جائے گی ۔ فرماتے ہیں ۔

یہ کہہ دے ــ " اللہ کے سوا کسی کا غلام نہیں ہوں گا "
تو دیکھے گا کہ تیرے رعب داب سے دنیا تھر تھرا رہی ہے
اللہ سے دعا کر ـــ ہمیں دنیا کے بڑے لوگوں کے برابر کر دے ۔
کسی کو ہماری دست گیری کرنے نہ دے
تو خود ہی دست گیری کر "

جو مرد اور عورتیں اس دنیا میں آزاد ہیں ۔
صرف وہی اللہ کے بندے اور بندیاں کہلاتے ہیں ۔

نذرالاسلام نے اپنی نظم ایک اللہ زندہ باد میں مسلمانوں اور غیرمسلموں کا نظریاتی موازنہ کرتے ہوئے کہا ۔

ان کو کینہ، و بغض پھیلانے دو
ہم کہیں گے ـــ
مساوات، امن اور ایک اللہ زندہ باد ۔
انہیں تنگ نظری، کبوتر کا گھونسلا اور گڈھے کی کیچڑ چاہیے دو ۔
ہم وسیع آسمان، دائمی روشنی، محنت اور عدم امتیاز چاہیں گے ۔

ـ

انہیں غلامانہ زندگی چاہنے دو ۔ ہم شہادت کا درجہ چاہتے ہیں
وہ ہمیشہ موت سے ہراساں ہیں ۔ ہم موت کو ڈھونڈتے ہیں ۔
وہ مرنا نہیں چاہتے ۔ جنگ چھڑنے پر وہ اروی کی جھاڑی
میں پناہ چاہتے ہیں ۔
وہ بے دنداں اور بے ناخن ہیں ۔ پھر بھی گھر کے آنگن میں

ستور کرتے ہیں۔

جو بدنظمی اور بدحالی چاہتے ہیں، انہیں اس کا خمیازہ ضرور بھگتنا ہوگا
انہیں اپنی راہ پر چلنے دو، ہم اپنی راہ پر چلیں گے۔
وہ طاغوتی حکومت چاہتے ہیں، ہم اللہ کی خلافت چاہتے ہیں۔
اس دنیا میں ہمیشہ خوشی کا دور دورہ ہوگا
اس میں کوئی روک ٹوک نہ ہوگی۔
ہمیں کوئی کمی محسوس نہ ہوگی ہمارا رب ہمیشہ مکمل ہے۔
لاش پر گدھ کی طرح چھینا جھپٹی کرنا ان کی عادت ہے۔
خدا ہمیں محفوظ رکھے خدا کرے کہ ہم کبھی اس راستے پر نہ جائیں۔!
ایک اللہ ہی ہمارا رب ہے جو ازلی جمیل ہے۔

مساوات اسلام کا اہم ترین اصول ہے۔ اسلام کے نزدیک سماجی حقوق میں سب انسان برابر ہیں۔ ایک عیش و عشرت میں دن گذارے اور دوسرا دانے دانے کو ترستا ہے ـــ یہ سلام کا طریقہ ہرگز نہیں۔ دولت کی غلط تقسیم کی وجہ سے عوام تنگ دست رہیں اور دولت صرف سرمایہ داروں میں مرکوز ہو کر رہ جائے۔ یہ اسلام کا قانون نہیں۔ بلکہ اسلامی مساوات کا روپ یہ ہے جو نذرالاسلام اپنی نظم میں پیش کرتے ہیں۔

آج دنیا بھر میں اسلام کا ڈنکا بج رہا ہے۔
چھوٹے بڑے کا فرق نہیں ـــ سب انسان برابر ہیں۔
نہ کوئی سلطان ہوگا، اور نہ کوئی رعیت
اسلام کا فرمان ہے ـــ "ہم سب ایک دوسرے کے لئے ہیں۔
ہم آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ سکھ دکھ کو برابر بانٹ لیں گے۔

کسی کو ذخیرہ اندوزی کا حق نہ ہوگا۔"

کیا کسی کے آنسوؤں کی قیمت پر کسی اور کے گھر کی بتی روشن ہوگی!

کیا معدودے چند "بلند نصیب" ہوں گے اور لاکھوں "بدنصیب"!

— یہ اسلام کا طریقہ ہرگز نہیں۔

مساوات، اسلام کا صرف نظریہ بن کر نہیں رہا بلکہ رسولِ کریم صلعم اور خلفائے راشدین نے اپنی زندگی میں اسے عملی جامہ پہنا کر دکھایا۔ حضرت عمر فاروق رضؓ کے عہدِ خلافت میں ان کے سپہ سالار عمرو بن العاص نے بیت المقدس کا محاصرہ کیا (۶۳۷ء) عیسائیوں نے کچھ دنوں مدافعت کی۔ لیکن جب ان کی قوت ٹوٹ گئی تو وہ صلح پر آمادہ ہوگئے اور یہ شرط پیش کی کہ امیر المومنین خود آ کر صلح کا معاہدہ لکھیں حضرت عمر رضؓ کو اس کی اطلاع دی گئی تو وہ ایک اونٹ ایک نوکر کو ساتھ لے کر بیت المقدس روانہ ہوئے۔ راہ میں دونوں باری باری اونٹ پر سوار ہوتے تھے۔ ایک اونٹ پر سوار ہوتا تو دوسرا اس کی نکیل کھینچتا چلا جاتا تھا۔ جب ان کی منزل قریب پہنچی تو سوار ہونے کی باری نوکر کی تھی چنانچہ وہ سوار ہو گئے اور خود خلیفہ عمر فاروق رضؓ، جن کے جاہ و جلال سے کج کلاہ شہنشاہ تک لرزہ براندام ہو جاتے تھے، معمولی لباس میں ملبوس اونٹ کی نکیل پکڑے بیت المقدس میں پکڑے داخل ہوئے۔ اس نظارے کو شاعر نے اپنی نظم حضرتِ عمر رضؓ میں کس خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کیا ہے، ملاحظہ ہو:-

نوکر اونٹ پر سوار ہوا۔ حضرت عمر رضؓ نے اس کی نکیل پکڑ لی۔
آدمِ خاکی (نوکر) کو آسمان پر چڑھایا اور خود چاند (عمر رضؓ) زمین
پر اتر آیا۔

مذہبِ اسلام میں رنگ و نسل کا کوئی امتیاز نہیں۔ یہاں قومیت وطن سے نہیں لہ اعتقاد سے بنتی ہے۔ یہ وہ قومیت ہے جو جغرافیائی حدود کی پابند نہیں۔ جو پاکستان ہندوستان اور انگلستان ہی کا نہیں بلکہ پوری دنیا کو احاطہ کر سکتی ہے اور جو اپنی

ہمہ گیری کے باعث ہیئتِ اجتماعیہ کی تشکیل کا واحد حل ہے۔ اس نظریہ کی بنا پر دنیا کے تمام مسلمان ایک ہی قوم کے افراد اور آپس میں بھائی بھائی بن جاتے ہیں یہ وہ اخوت ہے جس سے بہتر مثال آج تک تاریخ عالم پیش نہ کر سکی۔ عالمی اتحاد کے قیام کے لئے اس سے بہتر اور کوئی نظریہ پیش نہیں کیا جا سکتا نذرالاسلام نے اپنی شاعری میں جگہ جگہ قومیت کے اس اسلامی تصور کی ترجمانی کی ہے باقی رہی یہ بات کہ نذرالاسلام نے قومی نظموں میں اپنے وطن کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک ہی قوم کے افراد کیسے قرار دیا ہے؟ مثلاً

ترجمہ اسی نمبر میں کہیں اور ملاحظہ ہو۔

ایسے مقامات میں ذاتی یعنی قوم کا لفظ محض ایک جغرافیائی تصور رکھتا ہے۔ اور اس حیثیت سے اسلامی نظریہ سے متصادم نہیں ہوتا۔ ہر انسان فطری طور پر اپنی پیدائشی جگہ سے محبت رکھتا ہے اور اپنی بساط بھر اس کے لیے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے جغرافیائی تقسیم کے اعتبار سے ہم پاکستانی ہیں اور اس لئے پاکستان سے ہم سب کو محبت ہے نذرالاسلام بنگال کے شہری تھے بنگال سے ان کی وطنی محبت کا ثبوت ان کی نظموں اور گیتوں سے بخوبی ملتا ہے۔ فرماتے ہیں۔:-

ترجمہ اسی نمبر میں کہیں اور ملاحظہ ہو۔

وطنیت کے اس جغرافیائی تصور کے لحاظ سے نذرالاسلام اپنے وطن اور اہلِ وطن کے لئے جاں نثار ہیں۔ علامہ اقبال کو بھی جو اسلامی قومیت کے بہت بڑے مبلغ ہیں، اسی لحاظ سے اپنے ملک کا درد دکھ ہے انہوں نے ہندستان کی زبوں حالی کا ماتم ان الفاظ میں کیا ہے۔

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

نذرالاسلام دنیا کے گوشے گوشے میں پڑے ہوئے مسلمانوں کو ایک ہی قومیت کے رشتے میں منسلک کرنے اور ان میں برادری و ہمدردی کا جذبہ ابھارنے کے آرزومند تھے فرماتے ہیں ۔

عرب، مصر، چین، ہند
سارا مسلم جہاں میرا بھائی ہے
کوئی اعلیٰ اور کوئی ادنیٰ نہیں
یہاں سب ہی برابر ہیں ۔

اس حقیقت کو علامہ اقبال نے یوں پیش کیا

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہیں سارا جہاں ہمارا

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی نہ افغانی

نذرالاسلام مسلم ممالک کے دل سے بہی خواہ تھے۔ مسلم ممالک کو ترقی کے میدان میں گامزن دیکھ کر ان کی خوشی کا فوارہ اچھل پڑتا تھا۔ جب یہ اطلاع موصول ہوئی کہ کمال پاشا نے یونانیوں سے سمرنا کو واپس لے لیا، تو شاعر کی خوشی کی حد نہ رہی۔ انھوں نے مسرت بھرے جذبات میں کمال پاشا کو ان الفاظ میں مبارکباد دی ۔

شاباش بھائی! تجھے اور تیری شمشیر کو شاباشی دیتا ہوں
تو نے سب دشمنوں کو ایک دم موت کے گھاٹ اتار دیا ہے'
بولو بھائی — بولو!
دنیا میں ترکوں کی تیز تلوار سے کون نہیں ڈرتا ؟

[چپ ! راست ! چپ !]

"خوب کیا بھائی ، خوب کیا
بزدل وہ دشمن سب بالکل صاف ہو گیا
خوب کیا بھائی ، خوب کیا !

یہ نذرالاسلام کے الفاظ ہیں۔ اسی لئے جوں کے توں نقل کر دئے گئے۔

(کمال پاشا ، اگنی بینا)

ترکوں کی قومی بیداری اور فتح و نصرت سے متاثر ہو کر اقبال نے بھی ان کی یوں آؤ بھگت کی :-

ہوا آں ترک شیرازی دلِ تبریز و کابل را
صبا کرتی ہے بوئے گل سے اپنا ہمسفر پیدا
اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا ، تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا !

(طلوعِ اسلام ، بانگ درا)

مسلمانوں میں جذبۂ آزادی اور ہمت و جرأت کا فقدان دیکھ کر نذرالاسلام کا دل کڑھتا تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کو قول باری تعالیٰ

"کُنتُمْ خَیْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ"

(تم بہترین امت ہو۔ بنی نوع انسان کی بہتری کیلئے چنے گئے ہو۔)

یاد دلایا - قرآن اور حدیث میں مسلمانوں کی امامت و حکومت کے متعلق آئے ہوئے پیغامات کی طرف ان کی توجہ ان الفاظ میں مبذول کی ۔

وہ آزاد کہاں ہے ؟ پورے معنوں میں وہ آزاد مسلمان کہاں ہے ؟
وہ روح کہاں جو اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتی تھی ؟
اللہ جس کا رب تھا ، آج شیطان اس کا رب بنا ہوا ہے ۔ !
ڈھونڈھ کر دیکھا — مسلمان نہیں ہے ، کافروں کی بھرمار ہے ،—
کافر اسی کو کہتے ہیں ، جس پر خوف اور جمود چھایا ہوا ہو۔

تو یہ کیسے بھول گیا کہ مسلمان کسی کو غلام بنانے یا خود کسی کا غلام
بننے کے لئے دنیا میں نہیں آیا ہے۔
تو نے یہ سب کچھ فراموش کر دیا کہ تمام قید خانوں، بندھنوں
اور خوف و ہراس کو توڑنے ہی کے لئے قرآن اور نبیؐ نازل ہوئے تھے۔
(آزاد نتوں چاند)

اقبالؔ نے اس مفہوم کو اپنے الفاظ میں یوں پیش کیا :۔
شور ہے ہو گئے دنیا سے مسلماں نابود!
ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلماں موجود؟
وضع میں تم ہو نصاریٰ، تو تمدن میں ہنود!
یہ مسلماں ہیں! جنہیں دیکھ کے شرمائے یہود!

یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو
انور پاشا کا ایک سپہ سالار یونانیوں کے ہاتھ میں قید ہو گیا تھا۔ نذرالاسلام
نے اس کی زبان میں مسلمانوں کی بزدلی اور غداری کی تصویریں کھینچیں :۔
انور! انور!
ہم بے ایمان ہیں، ہم نیم جان بھی نہیں رہے۔
تو مسلمان کہاں ڈھونڈ رہا ہے؟ سراسر وحشی جانور ہیں۔
انور! انور!
جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، اس کی زبان پکڑ کر کھینچ لے!
بے ایمان صرف جان بچانا جانتا ہے
انور! اسے دھتکار دے۔

ان کے کاندھوں پر بھیک کا تھیلا ہے ـــ
تلوار کے ساتھ جن کی آزادی کا سبق شروع ہوتا تھا۔
اور جو ناقابل شکست تھے، آج وہ ناقابلِ تعریف بنے ہوئے ہیں۔
اور ا انہیں دھتکار دے :

ندرالاسلام، اسلام کی سنہری روایات کے قدر داں تھے۔ وہ آئینِ نو سے نہیں ڈرتے تھے اور طرزِ کہن پر بھی نہیں اڑے تھے۔ بلکہ یہاں جدّت و قدامت کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کا ماضی ان کے حال کی بہ نسبت زیادہ روشن ہے۔ اسی لئے انہوں نے پرانی روایات کی طرف ان کی توجہ مبذول کی۔ انہیں یقین تھا کہ اگر مسلمان وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ کے بارے واقف رہیں۔ اوران میں سلفِ صالحین کا ایمانی جوش و جذبہ کارفرما ہو، تو ان کا مستقبل روشن ہے فرماتے ہیں :-

ابوبکر صدّیق کی سچائی اور
عمر فاروق رضؓ کی قربانی آج نہیں رہی
بلال رضؓ کا ایمان بھی نہیں رہا۔
علی رضؓ کی ذوالفقار بھی نہیں رہی۔
جہاد کے لئے آج
ہمارا رشہدا بھی نہیں ہے
آج قوتِ بازو نہیں رہی
خالد، موسیٰ اور طارق بھی نہیں ہے۔
بادشاہت اور تختِ طاؤس نہیں رہا۔
جو دنیا کا مالک تھا آج فقیر بنا ہوا ہے
اسلام صرف کتاب میں ہے۔

اور مسلمان گور ہیں۔

(ذوالفقار)

نذرالاسلام کے یہ الفاظ ہمیں کلام اقبال کی یاد دلاتے ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کی سطحیت اور بے عملی کو دیکھ کر انہیں اپنے زوال پر یوں متنبہ کیا۔

واعظ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی
برق طبعی نہ رہی، شعلہ مقالی نہ رہی
رہ گئی رسم اذاں، روح بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا، تلقین غزالی نہ رہی
مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے
یعنی وہ صاحب اوصاف حجازی نہ رہے

اس میں شک نہیں کہ نذرالاسلام ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں کی آزادی اور خیر خواہی کے طالب تھے بلکہ ان کی یہ آرزو تھی کہ دنیا بھر کی مظلوم انسانیت کو نجات ملے مگر چونکہ اسلامی اصولوں کے بل بوتے پر وہ اپنی منزل مقصود تک پہنچنا چاہتے تھے، اس لئے ان کا مخاطب زیادہ تر مسلمان نوجوانوں سے تھا۔ انہیں کے ذریعے وہ عالمی بھائی چارہ اور امن و امان قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس نقطۂ نگاہ سے انہوں نے بالخصوص مسلمانوں کو ابھارنے کی کوشش کی۔ انہیں اپنی گم شدہ عظمت و شوکت یاد دلا کر حرکت و عمل کی طرف ان کی توجہ منعطف کی۔

نذرالاسلام کو مشرقی ممالک کی بیداری میں دنیا اسلام کی نشاۃ الثانیہ کا سامان نظر آیا۔ دوسرے اسلامی ممالک کو ترقی کے زینہ پر گامزن دیکھ کر انہوں نے خواب غفلت میں سوئے ہوئے پاک و ہند کے دس کروڑ مسلمانوں کو بیداری کا پیغام یوں دیا۔

چاروں طرف دین اسلام کی
سرخ مشعل پھر جل اٹھی ہے

اے بے خبر! تو بھی جاگ اُٹھ
تو بھی اپنے دل کا دیپ جلا

عراقِ اعظم میں فیصل جاگ رہا ہے
نیا ہارون رشید جاگ رہا ہے
دیکھ! نیند توڑ کر شام جاگ رہا ہے۔
صرف ہندوستان کے دس کروڑ
غافل مسلمان نہیں جاگ رہے ہیں۔

ہم اصحابِ کہف کی طرح
ہزاروں سال سے سو رہے ہیں
کسی وقت ہم میں کوئی بادشاہ تھا
آج بھی ہم اسی کی بڑائی کرتے ہیں۔
ہم جاگ اٹھیں تو دنیا پھر
ہمارے قدموں پر جھک جائے گی۔

(ذوالفقار)

نذر الاسلام جان و دل سے مسلمانوں کے عروج کے خواہاں تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری کی ہر منزل میں کم و بیش اسلامی اصولوں کی نشر و اشاعت کی۔ ان کی نظم "شط العرب"، "محرم"، "قربانی"، "کھیایا ریرترنی"، "خالد"، "عمر فاروق"، "صبح امید"، "فاتح دوازدہم"، "کمال پاشا"، "انور"، وغیرہ اس کا زندہ ثبوت ہیں۔ مگر ان کے آخری دور کی شاعری میں عشقِ الٰہی اور عشقِ رسولؐ کے جو والہانہ جذبات نظر آتے ہیں، وہ اس سے پہلے کبھی نظر نہیں آئے۔ سنہ ۱۹۳۰ء کے بعد انہوں نے مسلمانوں کو روحانی قوت اور ایمانی جوش و

مد بے سے سرشار کرنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے۔ ان کی کتاب "ذوالفقار،" "نوتن
باند،" "گل باغیچہ" وغیرہ ایسے پیغامات سے لبریز ہیں۔ ان کے خلوص اور ہمدردی کا یہ عالم تھا
کہ انہوں نے مسلمانوں کی ابتری اور زبوں حالی سے متاثر ہو کر خدا سے یوں دعا مانگی :-

اے خدا ! تو اسلام کو توفیق دے !
مسلمانوں کی دُنیا پھر آباد ہو !
انہیں گم شدہ سلطنت دوبارہ عطا کر :
قدیم قوت بازو اور دلِ آزاد عنایت کر !

اہلِ علم کو معلوم ہے کہ سورۂ فاتحہ کے کئی نام ہیں۔ از اں جملہ "ام القرآن" بھی ایک ہے
کے ایک معنی اصول کے ہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں اسلام کی اصولی باتیں
مالی طور پر بیاں فرمائی ہیں، اسی لئے یہ اس نام سے موسوم ہے۔ اس میں اجمالی طور پر توحیدٗ
الت، لعنت، عبادت اور دوسری اصولی چیزوں کا بیان ہوا ہے۔ نذر الاسلام نے
ں سورت کے مفہوم کو شاعری کا جامہ پہنا کر اسلامی اصولوں کی ترجمانی کی :-

اے سارے جہاں کے پروردگار ! سب خوبیاں تیری ہیں۔
تیرے رحم و کرم کی کوئی حد اور کنارہ نہیں۔
اے خدا ! تو ہی روزِ جزا کا مالک ہے۔
اے پروردگار ! ہم تجھی کو پوجتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔
اے مالک ! ہم کو سیدھا راستہ دکھا۔
اے خدا ! ہمیں ان کے راستے پر چلا جن پر تو نے احسان کیا۔
نہ ان کے راستے پر جو کافر ہیں، مرتد اور بہکے ہوتے ہیں۔
اے پروردگار ! ہم یہی چاہتے ہیں۔

(ذوالفقار)

نذر الاسلام کی مسلمانوں سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ انہوں نے اہلِ

اسلام سے دنیا کی امامت کا کام لینا چاہا۔ انہیں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ پر یقین تھا ۔ا ہ
ے فرطِ اشتیاق میں اہلِ ایمان کو ہے دور کی بشارت دی۔ انہیں بے دین ، مشرک اور کا
سے لڑنے پر اکسایا۔ انگریزوں کو اپنے ملک سے ہٹانے اور آزادی حاصل کرنے کی ترغیب
دی۔ میدانِ جنگ میں سر بلند ہو کر پوری استقامت کے ساتھ جاں بازی کرنے کی تلقین
کی۔ اسلامی جوش و جذبے سے سرشار ہو کر تلواریں لے کر آگے بڑھنے کا شوق دلایا۔ ا
اس بات سے آگاہ کیا کہ تم نے غفلت میں بہت سا وقت گنوا دیا ہے مگر اب بھی تلافیٔ
مافات کرنے کا وقت باقی ہے۔ چاروں طرف طوفان برپا ہے۔ تمہیں فوراً خوابِ غفلت
سے اٹھ کر اپنی عظمتِ رفتہ حاصل کر لینی چاہئیے۔ فرماتے ہیں۔۔

طبلِ جنگ بج رہا ہے۔ مسلمانو!
تم سر بلند ہو کر عمامہ باندھ لو!
عہدِ جدید کا پیغام آگیا ہے۔
ٹوٹے قلعے پر پرچم لہرا رہا ہے

لب پر کلمہ، ہاتھ میں تلوار
سینے میں انتھک اسلامی جوش
اور دل میں عشقِ الٰہی لے کر
بڑھے چلو، بڑھے چلو، بگل بج رہا ہے۔
تجھے کوئی خوف نہیں۔ تیرے گلے میں
قرآن پاک کا تعویذ بندھا ہوا ہے

ہم عیش و عشرت کیلئے نہیں پیدا ہوئے تھے۔
شہادت ہماری منزلِ مقصود تھی۔

جن کے خلفاء نے فقیروں کے بھیس میں
نصف دنیا پر حکومت کی تھی۔
آج وہ بے ہوش سو رہے ہیں
حالانکہ چاروں طرف طوفان برپا ہے
سوتے سوتے میری فجر کی نماز قضا ہو گئی
ظہر کے وقت بھی میں جاگ نہ اٹھا۔
غفلت اور کھیل میں عصر کی نماز بھی فوت ہو گئی
اب مغرب کی اذاں سن رہا ہوں
عشا کی جماعت میں ضرور شامل ہو جا
اب بھی جماعت میں جگہ خالی ہے

—

جس روکھی روٹی کے سہارے اور
جس ایمانی و روحانی قوت کی بدولت
ہم نے دنیا کو زیر و زبر کیا تھا۔
آج وہ قوت دوبارہ واپس لا
تکبیر کے نعرے سے دنیا کو ہلا دے۔
آسمان پر سرخ پرچم لہرا دے۔

(ذوالفقار)

نذر الاسلام کی شاعری میں اسلامی تہذیب و تمدن

بنکم سے رابندر ناتھ تک کے عہد میں جو بنگلہ ادب وجود میں آیا تھا وہ ہندو تہذیب

تمدن کا ترجمان تھا۔ ناول اور ناٹک میں مسلم کرداروں کو پست کرکے پیش کیا جاتا تھا۔ اسلامی ادب کا فقدان تھا۔ بے شک نذرالاسلام سے پہلے بھی میر مشرف حسین (۱۸۴۷ء ـ ۱۹۱۲ء) نے اپنی کتاب "بشاد سندھو" (منثور ۱۸۹۰ء)، "مدینار گورب" (منظوم ۱۹۰۶ء) "مسلم بیرتو" (۱۹۰۷ء)، اور "اسلامیر جی" (منثور ۱۹۰۸ء) وغیرہ میں، مزمل حق (۱۸۶۰ء ـ ۱۹۳۳ء) نے اپنی نظم کی کتاب "جاتیو فوارہ" (۱۹۱۲ء) "اسلامی سنگیت" اور "حضرت محمد" (۱۹۰۳ء) میں اور اسماعیل حسین سراجی (۱۸۸۰ء ـ ۱۹۳۱ء) نے اپنی اسلامی تصنیفات میں اسلامی تہذیب و تمدن کی ترجمانی کی مگر وہ سرمایۂ ادب ہندوانہ ذخیرۂ ادب کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر تھا۔ نذرالاسلام پہلے شخص ہیں جنہوں نے دو قومی نظریہ کی بنا پر ہندو اور مسلمانوں کے لئے الگ الگ ادب پیدا کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ بنگلہ ادب کو نظریاتی طور پر اسلامی جذبات و احساسات کا آئینہ دار بنایا ہے۔ اور ثابت کر دکھایا ہے کہ بنگلہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے۔ یہ صرف ہندوؤں کا ورثہ نہیں۔ مسلمانوں کو بھی اس پر حق حاصل ہے۔ نذرالاسلام نے ہندو میتھالوجی اور اسلامی تاریخ کا نچوڑ نکال کر ادب میں ان کا ایک بہترامتزاج پیدا کیا۔ اور اسے ایسا بنایا گویا کہ وہ گنگا جمنا اور دجلہ و فرات کا سنگم نظر آنے لگا۔ انہوں نے اگر یہ گایا۔

> سرزمین بنگال کے جھونپڑے سے دور افتادہ عرب کا خواب دیکھ رہا ہوں "

یہ بھی گایا۔

> پیارے! جب تلسی تلے شام کے وقت
> تو پرنام کرے گا تو ایک مرتبہ
> چوک سے ہی سہی، اپنے دیوتا کا نام لیتے ہوئے
> میرا نام بھی لینا!

نذرالاسلام کو اپنے آپ پر پورا اعتماد تھا۔ وہ خود دار اور غیور تھے وہ جو کچھ سمجھتے تھے، اس پر عمل پیرا بھی ہوتے ان سے پہلے ہی بنگال میں بہت سے مسلمان ادیب اور شاعر پیدا ہوئے تھے ۔ مگر بنگلہ ادب میں ان کا داخلہ ایسا ہی تھا جیسا کہ کوئی بیگانہ آدمی پرائے گھر میں جھجکتا اور ہچکچاتا ہوا داخل ہوتا ہے۔ اس زمانے میں وہ ارادی طور پر ایسی تشبیہات و استعارات اور محاورات و ضرب الامثال کے استعمال میں اسلامی نشانیوں اور اسلامی تہذیب و تمدن کے آئینہ دار لفظوں سے کتراتے تھے تاکہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ لکھنے والا ایک مسلمان ہے ۔

نذرالاسلام نے مسلمان اہلِ قلم کو اس احساس کمتری اور رسم و رواج کی بیجا پابندیوں سے نجات دلائی۔ انہوں نے اسلامی تہذیب و تمدن کے آئینہ دار لفظوں سے بنگلہ ادب میں جدت و وسعت پیدا کی، اسلامی واقعات و سانحات کے نئے نئے مضامین کی شمولیت سے اس کے ذخیرۂ مطالب میں ایک قابلِ قدر اضافہ کیا۔

اس جدت طرازی پر کسی کو اعتراض نہ ہوا ۔ اگرچہ شروع شروع میں بعض لوگوں نے چہ میگوئیاں کی تھیں مگر اعلام کار کوئی شخص بھی ان کے راستے میں روڑا نہ اٹکا سکا بلکہ جن لوگوں نے بنگلہ زبان و ادب کو بیرونی مداخلت سے محفوظ رکھنے کا عزم کر رکھا تھا۔ وہ بھی ان کی جدت طرازی کے قائل ہونے لگے اور اس طرز کو اپنانے کی کوشش کرنے لگے۔ ان کی جدت طرازی کا ایک نمونہ ان کی ایک نظم محرم میں دیکھئے انہوں نے اس نظم میں واقعات کربلا کا ایک سماں باندھ دیا ہے۔

ان الفاظ میں ایک بھی بنگلہ کا نہیں۔ پھر بھی انہوں نے اس خوش اسلوبی سے مضمون کو بیان کیا ہے کہ کلام میں کرختگی اور بھدے پن کے بجائے شیرینی، سلاست اور روانی پیدا ہو گئی ہے اور کسی کو مطلب سمجھنے میں بھی کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ اسی لئے ان الفاظ کو بلا ترجمہ اردو حروف ہی میں نقل کر دیتا ہوں ۔

نیل نیل آسمان لالِ لال دنیا
اماں لال تیری خوں کیا خونیا

ہماری تہذیب اور اسلامی شان و شوکت کو دوبارہ زندہ کرنا ان کا مقصد اولین تھا سرزمین بنگال میں پیدا ہونے کے باوجود انہوں نے گنگا جمنا، برہمپترا اور میگھنا وغیرہ کے گیت گانے سے پہلے ہی اسلامی روایات کے حامل "شط العرب" کے گیت گائے۔ "شط العرب" کو مخاطب کر کے کہا۔

شط العرب، شط العرب،
عہد قدیم سے تیرا ساحل مقدس رہا ہے۔
اس سرزمین پر عرب کے بہادروں نے
شہادت اور دلیری کا لہو بہایا ہے۔

(اگنی بینا)

یہ تو نذر الاسلام کے وہ گیت، نظمیں اور غزلیں ہیں جن میں انہوں نے وقتاً فوقتاً اسلامی اصول اور اسلامی معاشرے کی عکاسی کی ہے علاوہ ازیں انہوں نے مستقل طور پر قرآن مجید کے پارۂ عم کا منظوم ترجمہ کیا۔ نبی کریم صلعم کی سیرت پر مرو بھاسکر (معارِ صحرا) کے نام سے ایک منظوم کتاب (نامکمل) پیش کی یہ دونوں شاعر کے ایسے کارنامے ہیں جو ہمیشہ اس بات پر گواہی پیش کریں گے کہ وہ بنگلہ ادب میں اسلامی تہذیب و تمدن کے ایک بہترین ترجمان ہیں۔

نذرالاسلام کی شاعری میں خودی اور خدا

حافظ ، غالب اور ٹیگور کی طرح نذرالاسلام نفیٔ خودی کے قائل نہیں بلکہ وہ رومی اور اقبال کی طرح اثباتِ خودی کے حامی ہیں - ان کا خیال یہ ہے کہ اثباتِ خودی ہی سے انسان اپنی تکمیل کو پہنچ سکتا ہے ۔ نفیٔ خودی سے نہیں اس لئے خدا میں ضم ہوکر اپنی خودی کو کھو دینا ان کی غیرت گوارا نہیں کرتی - وہ اپنی ہستی کو بچا رکھتے ہوئے خدا سے ملنا چاہتے ہیں - یہی وجہ ہے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح خدا کی دیدار میں ہوش و حواس کو کھو کر یا منصور حلاج کی طرح اپنی خودی کو مٹا کر راہِ خدا میں دیوانہ ما پسند نہیں کرتے ۔

فرماتے ہیں -

میں موسیٰ (عا) نہیں کہ ڈر سے بیہوش ہو جاؤں ،
میں منصور نہیں کہ انا الحق کہہ کر بے خود بن جاؤں ۔

(گل اغنچہ)

نذرالاسلام نے اپنی نظم " الیشور" میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ خدا کو جنگلوں میں ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ۔ خدا انسان ہی میں موجود ہے ۔ ہر شخص معرفتِ نفس سے معرفت خدا حاصل کر سکتا ہے ۔ رسول کریم صلعم نے فرمایا ۔

" مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ ، فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ "

" جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا ، اس نے اپنے رب کو بھی ضرور پہچان لیا "

پیغمبرِ خدا نے دوسری جگہ ارشاد فرمایا -

" قُلُوْبُ الْمُؤْمِنِ عَرْشُ اللّٰہِ "

مومن کا دِل خدا کا عرش ہے :

اس بات کو کسی فارسی شاعر نے یوں بیان کیا ہے :-

من نہ گنجم در زمین و آسماں
لیک گنجم در قلوب مومناں

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان اپنے دل ہی میں خدا کو پا سکتا ہے ۔

نذرالاسلام نے اس خیال کو یوں پیش کیا ہے :-

تو اگر اپنی ذات کو پہچان سکے
تو خدا کو ضرور پہچان سکتا ہے ۔
تو اپنے روحانی آئینے میں
اس ذات منور (خدا) کو دیکھ لے ۔

(ذوالفقار)

اے برادر ! تو کون ہے کہ زمین و آسمان میں خدا کو ڈھونڈتا پھر رہا ہے ؟
تو کون ہے کہ اس کی تلاش میں جنگل جنگل اور پہاڑ کی چوٹی پر پھر رہا ہے ؟
افسوس اے رستی ! اے درویش !
تو اپنے سینے کے جوہر کو سینے ہی میں رکھ کر اسے ملک ملک ڈھونڈھ رہا ہے ۔
کائنات تیرے منہ کو تک رہی ہے تو اپنی آنکھیں بند کئے ہوئے ہے
تو خالق کو ڈھونڈ رہا ہے ؟
گویا تو اپنی ذات کو ہی ڈھونڈھ رہا ہے ؟
ارادی طور پر تو اندھا بن بیٹھا ہے ! آنکھیں کھول ،
دل کے آئینے میں اپنی ذات کو دیکھ
تجھے اپنی ذات ہی میں اس (خدا) کا عکس ضرور ملے گا ۔

سبھوں میں اسی کا جلوہ کار فرما ہے، وہ سبھوں میں موجود ہے۔
میں اپنی ذات کو دیکھ کر اپنے آن دیکھے خالق کو پہچان لیتا ہے۔
(الیتور، سرب ہارا)

اللہ تعالیٰ نے انسان کی ذات میں بے پناہ قوتیں ودلیعت کر رکھی ہیں۔ انسان کی شخصیت اور خودی بلند ہو، تو وہ ان قوتوں کو بروئے کار لاسکتا ہے۔ تمام آسمان وزمین پر غلبہ پاسکتا ہے۔ قرآن شریف میں آیا ہے۔

"وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ"

اس نے آسمان وزمین کا سب کچھ تمہارے قبضے میں کر رکھا ہے۔

نذرالاسلام انسانی امکانات سے واقف تھے۔ ان کو اپنی شخصی قوت پر پورا یقین تھا۔ ان کی خودی اور خود اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ وہ کسی کے آگے اپنا سر جھکانا نہیں جانتے تھے۔ جب ہی تو انہوں نے ڈنکے کی چوٹ کہا:۔

اے بہادر تو کہہ دے
میں ہمیشہ سربلند ہوں
میں سربلندی کو دیکھ کر
ہمالہ کی چوٹی بھی سرنگوں ہو جاتی ہے
میں خدا کے عرش سے بھی آگے نکل گیا ہوں
میں پروردگارِ عالم کا دائمی عجوبہ ہوں

(بدروہی، اگنی بینا)

تصورِ خودی میں اقبال اور نذرالاسلام ہم آہنگ نظر آتے ہیں نذرالاسلام اپنے زورِ خودی سے خدا کو اپنے دل میں جذب کرلینا چاہتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

میں اپنے دل ہی میں خدا کے عرش کو لا بٹھاؤں گا۔
(گل باغیچہ)

اقبال نے بھی یہی کہا ہے -

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اقبال اور نذرالاسلام بہت سی بنیادی باتوں میں ہمنوا ہیں - دونوں خودی اور انفرادی قوت کے قائل ہیں - دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ انسان اپنی قسمت کا خود خالق ہے - وہ اپنی تعمیر خودی سے اپنی تقدیر بھی بدل سکتا ہے - ایک طرف ہمیں اقبال سناتے ہیں :-

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں ۔

دوسری طرف نذرالاسلام ہمیں یہ پیغام دیتے ہیں :-

تقدیر بدل گئی ہے - آج اسی (مسلماں) کا نعرۂ تکبیر بلند ہو رہا ہے
(ذوالفقار)

اقبال کا نظریۂ بےخودی ان کے نظریۂ خودی کا تکملہ ہے - وہ اپنی خودی کو ملت میں گم کر دینا چاہتے ہیں - انفرادی قوت سے معاشرے کی فلاح بہبود حاصل کرنا ہی ان کی بےخودی کا مقصد اصلی ہے

فرماتے ہیں -

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے، تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

نذرالاسلام کی شاعری میں بھی نظریۂ بےخودی کا تصور ملتا ہے - ان کے یہاں مساوات، عالمگیر جمہوریت اور انسان دوستی کے جو پیغامات ملتے ہیں - انہیں میں اقبال کے نظریۂ بےخودی کی روح کارفرما ہے - وہ بھی اقبال کی طرح اپنی خودی کو قوم اور ملت کے لئے وقف کر دینا چاہتے ہیں - انسانیت کی ترقی میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں - ان سے اگر ہم یہ سنتے ہیں -

میں اپنے کو چھوڑ کر کسی کے سامنے سر نہیں جھکاتا ہوں ۔

تو پھر یہ بھی سنتے ہیں ۔

آدمی سے بڑا کچھ نہیں ۔ کچھ بھی اس سے محترم نہیں ۔

نذر الاسلام پر حالی اور اقبال کا کافی اثر نظر آتا ہے ۔ حالی اور اقبال نے مسلمانوں کو صحرائے عرب کے سیدالمرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغامات سنا کر ان میں جوش عمل اور جذبۂ ایمان پیدا کرنے کی کوشش کی اور ان کی کوشش کامیاب بھی ہوئی ۔ نذر الاسلام کو ان کی تہذیب حجازی کی دعوت بہت پسند آئی ۔ انہوں نے حالی ، اکبر، اقبال اور تہذیب حجازی کے دوسرے علم بردار شاعروں کا ان الفاظ میں استقبال کیا ہے ۔

اے ریگستان کی باتیں سنانے والے !

تیری غیر موجودگی میں بھی ہم چاروں طرف تیری آمد آمد کا غلغلہ سن رہے ہیں ۔

تیز قدمی کے ساتھ تو ہمارے درمیان آرہا ہے ۔

اے بدیسی شاعر ! تو بڑھ کے سائے میں اپنی بانسری روک لے ۔

تیری سعی بار آور ہو چکی ہے ۔

اے پیش رو قافلہ والو !

تیز قدمی سے چلو ! بڑھے چلو !

(اگر دیتھک ، رنجیر)

نذرالاسلام کی شاعری میں حضرت محمد صلعم

سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا
اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا
(اقبالؒ)

نذرالاسلام نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کثیر تعداد میں نظمیں اور غزلیں لکھیں۔ یہ ان کی مدح سرائی کرتے ہوئے مسلمانوں کو ان کے اسوۂ حسنہ پر گامزن ہونے کی ترغیب دی۔ اس موضوع پر نذرالاسلام کے بعض شاہکار مثلاً "فاتح دوازدھم"، "تورا دیکھے جا آمنہ مانیئر کولے (تم ماں آمنہ کی گود میں دیکھ لو)۔" سہاراتے پھٹلرے پھول رنگین گلے لالہ (صحرا میں رنگین گل لالہ کھل چکا ہے)، "بکھے آمار کعبار چھبی چکھے محمد رسول" (میرے سینے میں کعبے کی تصویر اور آنکھوں میں محمد الرسول اللہ ہیں) ایسے اعلیٰ درجے کے ہیں کہ دنیا کی دوسری زبانوں میں اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔

نذرالاسلام نے جو نظمیں اور غزلیں رسولِ کریمؐ کی شان میں لکھی ہیں، وہ رسول کریمؐ کی تعلیمات، ولادت، وفات اور زندگی کے مختلف پہلوؤں پر حاوی ہیں۔ جب وہ نعت پر قلم اٹھاتے ہیں تو ان کے الفاظ اور ان کا اسلوب بیان اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ وہ مدح سرائی کی خاطر مدح سرائی نہیں کرتے بلکہ رسول کریمؐ کا شیدا بن کر بے ساختہ دلی عقیدت کا اظہار کیئے جاتے ہیں۔ جب آپ کی ولادت پر خامہ فرسائی کرتے ہیں، تو جہان کا جنت کا نمونہ بنا دیتے ہیں۔ دوسری طرف جب وفات کا بیان شروع کرتے ہیں، تو پوری دنیا میں صفِ ماتم بچھا دیتے ہیں۔ ان نظموں اور غزلوں میں بیا زمندانہ اظہارِ عقیدت کے علاوہ انہوں نے ایک ہمہ گیر اصولی بات بھی بتائی ہے۔ وہ یہ ہے کہ آپؐ کی سیرت مجسمۂ قرآن ہے۔ آپ کی زندگی بنی نوع انسان کے لئے مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ آپ کی تقلید میں انسانیت کی نجات مضمر ہے۔

رسولِ کریمؐ کی ولادت پر لکھتے ہیں:-

ہمارے پاس تاج نہیں ہے\
تو کیا عار!\
اے مسلمانو! تم کھجور کی پتیوں سے اپنے آپ کو سنوار لو!\
سارا جہان انہیں تسلیم کر رہا ہے۔\
'ہر کورنش' میں یہی اعلان ہو رہا ہے۔

سُن لو! آج روئے زمین کو "حسرا" کیا۔
مژدہ سُنا رہا ہے۔

یمن، نجد، حجاز، تہامہ، عراق، شام۔
مصر، عمان اور طہران کس عظیم الشان ہستی کے نام پر
یہ وِرد کر رہے ہیں ـــ صلی اللہ علیہ وسلم۔

ہر طرف تیاریاں ہو رہی ہیں۔
سواریوں کا غلغلہ ہے۔
کیا ہی حسین سماں ہے کہ حوریں اور پریاں سرشار ہو کر
فردوس کا حمام کھول رہی ہیں۔
ان کی کمروں پر گھڑوں میں آبِ کوثر چھلک رہا ہے
سن لو! دمامے، توپیں اور تمام ساز و سامان
بلند آواز سے کس کے نام پہ
یہ وظیفہ پڑھ رہے ہیں ـــ صلی اللہ علیہ وسلم۔

اے مستان!
بس رک جا!
دیکھ لے، آج سیستان کا بوستان کس قدر سرشار ہے۔
رستم، دربان بن کر بے نیام تلوار لئے کھڑا ہے۔
کہربا باجہ بج رہا ہے۔ ہر جا گلزار بنا ہوا ہے
ہر سو چہل پہل ہے!

جنوب میں بحیرۂ عرب موجزن ہے ۔ وہ خوشی میں باغ باغ ہے
مغرب میں بحیرۂ احمر کے نیلے پانی میں خون خوشندہ میں
آگ لگ رہی ہے ۔
صحرا، اور گوبی کے ریگستانوں میں ہریالی جھلنے لگی ہے ۔

کرسی کے نور سے
طور کی چوٹی معمور ہے ۔
ہر سو حوریں ملبتے ہوئے مسرت کے گیت گا رہی ہیں ۔
ایرانیوں، درّانیوں اور ترکوں کی سُرخ دستاروں سے
شوخ رنگت ٹپک رہی ہے ۔
آج بدّو اپنے اپنے گھوڑے چھوڑ کر
اور تیرے پھینک کر
یہ درود پڑھ رہے ہیں ــــ صلی اللہ علیہ وسلم "

وفات پر دو بند ملاحظہ ہوں :-

وفات پر ۔

(۱)

کیا ہی درد ناک منظر ہے ، عزرائیل کی آنکھیں بھی پُرنم ہیں !
اس کا پتھر دل بھی آج کانپ رہا ہے ۔
گویا وہ بخار میں کراہ رہا ہے ۔
اس کا جانگداز اور مضبوط پنجہ آج بالکل ڈھیلا ہو گیا ہے ۔
اس کا قبضہ بے قابو اور ڈھیلی ہو گیا ہے ۔

اس کا سیلا تاج خاک چوم رہا ہے۔
جبرائیل کے آستین بار و چور چور ہو گئے ہیں۔
آج تو وہ فارغ الذمہ ہو رہا ہے پھر بھی اس کا دل بے چین ہے!
میکائیل دریائے نور کا تمام پانی
ساری کائنات پر مسلسل برسا رہا ہے۔
سرد ہوا کی لہروں سے جھاؤ کے درخت لرز رہے ہیں
کیا یہی چاند کی بارہویں ہے؟ کیا یہ وہی ربیع اوّل ہے؟

شمالی مغربی کونے میں سیاہ جھنڈا کانپ رہا ہے۔ اسرافیل کا
صور بھی آج کراہ رہا ہے۔!
جان ورسا ارق آٹھ آٹھ آنسو رو رہی ہے!
رسولِ کریم کے دروازے پر عزازیل شیطان کیوں کھڑا ہے۔؟
اس کے سینے پر بھی آنسو بہہ رہے ہیں۔
مدینے کے تمام میدان غرقاب ہو رہے ہیں۔
براق ایک ایک سمت میں آسمان کی خبر لے رہا ہے
اور عرش کی طرف نگاہ اٹھائے ڈاڑھیں مار مار کر رو رہا ہے۔
زور زور سے رو رہا ہے
ہائے! حوریں اور پریاں
پرنم آنکھوں سے دیکھ رہی ہیں۔!
آج اشک ریزیوں سے جہنم کے شعلے تک بجھ گئے ہیں۔
فردوس کے تمام لالے اور نرگسیں خوشبودار آنسو بہا رہی ہیں
(واقعۂ دوازدہم، بشیر ناشتی)

اس میں شک نہیں کہ نذرالاسلام بنگلہ ادب کے پہلے شخص ہیں جن کی شاعری پر پورے طور پر نظریۂ مساوات اور عالمگیر برادری کی ترجمانی ملتی ہے۔ انہوں نے ایک ایسے معاشرے کا خواب دیکھا جو ظلم و ستم سے پاک ہو، جہاں لوگ اپنے ارادوں کے مطابق اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کر سکیں، امن وامان اور فارغ البالی کے ساتھ دن گذار سکیں۔ ایسے معاشرے کو بروئے کار لانے کیلئے انہوں نے رسول کریمؐ کی زندگی کو ایک مثالی زندگی کی حیثیت سے پیش کیا۔ سب سے پہلے رسولِ کریمؐ کی عالمگیر برادری اور ہمدردی کے پیغامات نے شاعر کی توجہ جذب کرلی یہی وجہ ہے کہ جہاں لوگوں نے " لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاک "

(اللہ تعالیٰ نے رسولِ کریمؐ کی شان میں کہا ــــ اگر مجھے آپ کی ولادت منظور نہ ہوتی ، تو میں ہرگز یہ کائنات پیدا نہ کرتا۔ حدیث) سے آپ کی تعریف کی۔ وہاں شاعر نے ان الفاظ میں ان کی توصیف کی ـــ" اگر آپ یتیم ہو کر دنیا میں پیدا نہ ہوتے تو غریب، یتیم اور مظلوم انسانیت کے دکھ درد کو دل سے محسوس نہ کر سکتے ۔ جہاں عام لوگوں نے انہیں "حبیب خدا" کے لقب سے نوازا ہے، وہاں شاعر نے انسان دوستی کا سہرا ان کے سر باندھا ہے فرماتے ہیں ۔۔

(ترجمہ کسی اور صفحہ پر ملاحظہ ہوں۔)

نذرالاسلام کی چند مقبول عام نعتیہ غزلیں پیش کی جاتی ہیں :۔

میرے سینے میں کعبے کی تصویر ہے۔
اور آنکھوں میں محمد الرسول اللہ کا جلوہ ہے۔
میرے سر پہ خدا کا عرش ہے۔
میں اسی کے والہانہ گیت گاتا ہوں۔

لیلیٰ کی محبت میں مجنوں متوالا تھا
اور میں لَا اِلٰـہ کا متوالا تھا۔

درویش خدا مست مجھے پہچانتا ہے۔
غیر عاشق تو مجھے پاگل کہتا ہے۔

میرا دل خوشی کا باغ ہے۔
اس میں بلبلیں ہمیشہ نغمہ سرائی کرتی ہیں۔
وہ رسم خدا کے طالب ہیں
اور میں عشقِ الٰہی کا طالب ہوں۔

میرے دل کی مسجد میں ہزاروں مؤذن
اذان دیتے ہیں۔
میری لوحِ جان پر قرآن مکتوب ہے
میری روح رات دن اس کی تلاوت کرتی ہے۔

خاتونِ جنت رض میری ماں ہیں۔
حسنؓ اور حسینؓ میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہیں۔
اس لیے میں روزِ قیامت کے دشوار گذار پل صراط سے۔
ہرگز نہیں ڈرتا ہوں۔

(ذوالفقار)

صحرا میں ایک پھول کھلا ہے
اور یہ رنگین گلِ لالہ ہے۔
اسی پھول کی خوشبو سے

ساری دنیا مہک گئی ہے۔

اسی کی خاطر چاند، سورج اور ستاروں میں
رقابت ہو رہی ہے۔
نیلا آسمان چپ چاپ
جھک کر اسے چوم رہا ہے

اس پھول کی روشنی سے
عرش اور کرسی روشن ہو گئے ہیں۔
اسی کے رنگ میں
ساری کائنات رنگ چکی ہے۔

اس باغ میں لاکھوں
پرندے آتے ھیں۔
اس پھول کو سینے سے لگانے کے لیے
درخت کی شاخیں لہرا رہی ہیں۔

جن، انسان، حوریں، پریاں اور فرشتے
سب ہی اس پھول پرستار ہیں۔
فقیر، درویش اور بادشاہ
اسے اپنے گلے کا ہار بنانا چاہتے ہیں۔

عاشق مزاج بھونروں اور بلبلوں کو
اس پھول کا پتہ ضرور معلوم ہے
کوئی اسے "حضرت محمدؐ"
اور کوئی "کملی والا" پکارتا ہے۔

(ذوالفقار)

تم ماں آمنہ کی گود میں دیکھ لو۔
وہاں چودھویں کا چاند جھول رہا ہے۔
گویا صبح کی گود میں سرخ آفتاب جھول رہا ہے
ساری دنیا میں یہ غلغلہ ہے کہ وہ کون آیا ہے؟
کلمۂ شہادت لب پر لئے ہوئے وہ کون آیا ہے؟
آسماں اور تارے اس کی طرف جھکنے لگے ہیں
وہ کون آیا ہے؟
بہشت کے دروازے کو کھول کر
فرشتے درود پڑھ رہے ہیں۔

(ذوالفقار)

(اس غزل کا باقی حصہ کسی اور صفحہ پر ملاحظہ ہو)۔

"صلِّ علیٰ محمد مصطفیٰ"
تو بادشاہوں کا بھی بادشاہ ہے۔ تو کملی والا ہے
تیری آمد سے ظلم و عصیاں بھری تاریک دنیا
بہشت کے نور سے معمور اور روشن ہوگئی ہے۔

گنہگار امت کے لئے تجھے کبھی چین نہیں ملا۔
تو اکیلا رو رہا ہے
قیامت کے دن پیاسی امت کیلئے
تو "شراباً طہورا" کا پیالہ لئے کھڑا رہے گا
حشر کے دن جب نصف النہار کا آفتاب سر پہ تاباں ہوگا۔
اور سب نبی "نفسی نفسی" کہنے لگیں گے۔
اس وقت تو ہی اکیلا "یا امتی یا امتی" کہہ کر
خدا کا عرش چومتا رہے گا۔ روتا رہے گا۔
گنہگار امت کی نجات ہی تیری دھن ہے
اولیاء و انبیاء تیرا ہی دھیان کرتے ہیں
خود خدا نے تیری تعریف کی ہے۔

(گل باغیچہ)

ان نعتوں سے قارئین کو اندازہ ہوگا کہ شاعر کو اللہ اور اللہ کے رسول سے کس قدر محبت تھی یہ وہ غزلیں ہیں جو مذہبی محفلوں میں گائی جاتی ہیں مذہبی جوش جذبے سے بے بہرہ آدمی کے سامنے بھی یہ غزلیں پڑھی جائیں تو اس پر ایک کیفیت ضرور طاری ہوگی۔ جو لوگ نذرالاسلام کی شاعری اور ان کے مذہبی عقائد کے متعلق چہ میگوئیاں کرتے ہیں وہ بھی ان غزلوں کو سن کر داد دئے بغیر رہ نہیں سکتے۔ ان کی نعتیہ غزلوں کی زبان میں ایسی سلاست، روانی اور شیرینی ہے، دل چاہتا ہے کہ انہیں بار بار پڑھے اور لطف اٹھائے ! جس شاعر نے یہ کہا تھا کہ
"میں کسی کے آگے اپنا سر نہیں جھکاتا ہوں
ان میں نیازمندی کا یہ عالم ہے کہ۔
عشق الٰہی کی شراب پی کر

میں مدہوش پڑا رہتا ہوں ۔

یہ وارفتگی ان کی انانیت کی تندی میں توازن پیدا کرتی ہے ۔ بالفاظ دیگراں کی شاعری میں ناز ہے تو وہ "بے لذت نیاز نہیں"۔

ان کے یہاں ناز کے پہلو بہ پہلو نیاز بھی موجود ہے ۔ اقبال بھی ہمیں یہی سناتے ہیں ۔

خودی کی شوخی و تندی میں کبر و ناز نہیں
جو ناز ہو بھی ، تو بے لذت نیاز نہیں

نذرالاسلام اور ان کا مذہب

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملاّ کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور

(اقبال)

عام طور پر نذرالاسلام "باغی شاعر" کے نام سے مشہور ہیں اس لئے ان کی
شاعری سامراج، سرمایہ داری، سماج کے فرسودہ آئین و قانون اور رسم و رواج کی کورانہ تقلید
سے بغاوت ہے۔ وہ ظلم بھری دنیا کے نقشِ کہن کو ٹھوکر سے اُڑا دینا چاہتے ہیں وہ ایسے سینکڑوں
لمحوں میں جذبات کی رو میں اس قدر بہہ جاتے ہیں کہ نہ صرف موجودہ نظام ان کے سامنے ایک بے معنی
حقیقت ہو کر رہ جاتا بلکہ ان کی شاعری کا ایک معتدبہ حصہ بظاہر ان کی جارحانہ اور سفاکانہ
ذہنیت کا پتہ دیتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

میں اکیلا خون نہیں بہا سکتا ہوں
اس لئے یہ خونبار الفاظ لکھے جاتا ہوں

وہ نہ صرف کسی کے آگے سر جھکانا گناہ سمجھتے ہیں بلکہ اپنی سربلندی کا دعویٰ کرتے ہوئے
خدا کے عرش سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔ ایک طرف اسلامی اصولوں کا سبق سکھاتے ہیں
تو دوسری طرف شیام سنگیت اور وشنو سنگیت بھی گائے جاتے ہیں۔ مسجد کے امام پر حملہ کرتے
ہیں تو مندر کے پروہت پر بھی وار کرنے سے نہیں چوکتے۔ دنیا کے من گھڑت نظام کے خلاف سے
بغاوت کر کے دم نہیں لیتے بلکہ کبھی کبھی خالقِ کائنات سے بھی شوخیاں کر گذرتے ہیں۔
یہی وجہ ہے کہ بعض کوتاہ نظر لوگوں نے شاعر کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کئے بغیر
انھیں جنگ جو، تخریب پسند، ہندو پرست، لامذہب، ملحد، کافر وغیرہ الزامات سے

مطعون کیا۔ ان کی شاعری کی قدر کرنا تو دور کی بات ہے۔ ان کے خلاف ملک میں زہرافشانی کرنے میں بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

حقیقت یہ ہے کہ نذرالاسلام کے پہلو میں ایک حساس اور دردمند دل تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ دلیر اور غیور بھی تھے۔ انہیں دنیا کی ناانصافیاں اور بدعنوانیاں ایک آنکھ نہ بھائیں وہ مجدد زمانہ اور مجاہدانہ جذبات کی رو میں بے قابو ہو کر بغاوت اور انقلاب پر تل گئے۔ اور سماج کے بوسیدہ نظام کو توڑ پھوڑ کر مسمار کر دینا چاہا۔ انہوں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ مذہب کا نام زبان پر لاتے تو ہیں مگر ان کے دل میں مذہب اور انسانیت کا کوئی احترام نہیں ہوتا وہ مذہب کی آڑ میں اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں۔ قرآن اور وید کے پیغامات تو سناتے ہیں مگر انسان کے خون چوسنے میں دریغ نہیں کرتے۔

نذرالاسلام نے اپنی نظم مانوستس (انسان) میں مفاد پرست اہلِ مذہب کے خلاف آواز بلند کی اور کہا۔۔ مذہب انسان کے لئے ہے۔ انسان مذہب کیلئے نہیں ہے بہت سے دنیاپرست مذہبی رہنما بغل میں کتابیں دبائے پھرتے ہیں مگر انسان کا خون چوسنے میں کوئی کوتاہی بھی نہیں کرتے۔ ان سے مذہبی کتابیں چھین لینی چاہئے۔ یہ لوگ دراصل شیطان ہیں، مذہبی پیشوا نہیں۔

شاعر کے الفاظ میں ملاحظہ ہوں۔

واہ! وہ کون ہیں جو قرآن، وید اور انجیل کو چوم رہے ہیں۔
ان سے زبردستی کتابیں چھین لو۔
انسان ہی کے لئے کتاب نازل ہوئی تھی، مگر مذہب کا دم بھرنے والی۔
ایک جماعت انسان کو تباہ کر کے کتاب کی پوجا پاٹ کر رہی ہے۔
انسان ہی کتاب کو لایا ہے۔ کتاب انسان کو نہیں لائی۔

(مانوستس، سربہارا)

ظاہر ہے کہ جب انسان کمزور اور بے قابو ہوجاتا ہے اور اسے اپنے مطلب براری کا

کوئی سہارا نظر نہیں آتا، تو وہ تقدیر کے بہانے اپنا دکھ بھول جانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ تقدیر کا لکھا ٹل نہیں سکتا۔ یہ خوش رہتا ہے اور خیالی پلاؤ پکاتا رہتا ہے کہ ایک دن خدا تقدیر چمکائے گا اور اس کی ساری تکالیف کا خاتمہ ہو جائے گا۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا ہے اور قسمت کا بھروسہ کرکے ظلم و ستم برداشت کئے جاتے ہیں۔ مگر خونخوار ظالم کے دل میں رحمت و رافت نہیں ہوتی۔ وہ غریبوں اور بیکسوں کا آخری قطرہ تک اپنے لئے حلال سمجھتا ہے۔ مظلوم آسمانی تائید کا انتظار کرتا ہے۔ مگر تقدیر چمکتی نہیں۔ وہ روتی ہے اور تقدیر ہنستی ہے۔ حالانکہ وہ اس حقیقت سے بے خبر ہے کہ اس پر ٹوٹے ہوئے مصائب و آلام کیلئے اس کی تقدیر ذمہ دار نہیں بلکہ وہ خود مجرم ہے۔ اس کا معاشرہ مجرم ہے۔ اس لئے شخصی زندگی میں انسان خود اپنی تقدیر کا خالق ہے اور قومی زندگی میں معاشرہ خود اپنی اجتماعی تقدیر کا خالق ہے۔

قرآن پاک میں متعدد موقعوں پر اس بات کی وضاحت کی گئی ہے ۔۔

"لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی" اور

لَہَا مَا کَسَبَتْ وَعَلَیْہَا مَا اکْتَسَبَتْ"

کہکر ہر فرد و بشر کو کلیتہً اس کے اعمال کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ بار بار اس پر زور دیا گیا کہ "اگر کوئی شخص اپنے آپ کو پاک کرے گا تو وہ اپنی ذات ہی کے واسطے ایسا کرے گا (ومن تزکی فانما یتزکی لنفسہ)۔ اگر کوئی محنت و مشقت کرے گا تو اس کا پھل خود ہی پائے گا۔ (ومن جاھد فانما یجاھد لنفسہ)۔ اور اگر کوئی نیکو کاری اختیار کرے گا تو خود اسی کا اس میں بھلا ہوگا۔ (ومن عمل صالحا فلنفسہ) اور کوئی بھلا کرے گا تو اپنے ہی لئے کرے گا اور اگر برائی کریگا تو وہ بھی اپنے ہی لئے ہے۔ (ان احسنتم احسنتم لانفسکم وان اسأتم فلھا)۔

نذرالاسلام جنگ سے واپس آئے تو دیکھا کہ ملک زبوں حالی میں پڑا ہوا ہے عوام کی قوت شل ہو چکی ہے۔ ان کی قوت ارادی بیکار ہو گئی ہے۔ پورے معاشرے

پر جمود چھایا ہوا ہے ۔ سامراج اور سرمایہ داروں کے پنجے میں پڑ کر لوگ آہیں بھرتے ہیں مگر اینٹ کا جواب اینٹ سے دینے کی ہمت نہیں ملک کی اس نازک حالت نے انھیں بغاوت پر ابھارا ۔ انہوں نے بھانپ لیا کہ سامراج اور سرمایہ دارانہ نظام حکومت کی وجہ سے عوام پر تباہی آئی ہوئی ہے ۔ اس لئے وہ حکومت کے خلاف ایسے جھنجھلائے کہ انگریز سامراج لرز اٹھا ۔ دوسری طرف انہوں نے اپنی گرجدار آواز سے عوام کو ایسا جھنجھوڑا کر ان میں خود اعتمادی اور خود داری کا جذبہ جاگ اٹھا ۔ ملک بھر میں اعصابی جنگ (cold war) چھڑ گئی اور رفتہ رفتہ سماج دشمن عناصر کے پاؤں تلے سے زمین سرکنے لگی ۔

نذرالاسلام نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اپنے مذہبی رہنماؤں کے خلاف بھی بغاوت کی جو النسانیت سے معرّا اور اپنی مطلب براری میں اندھے بنے ہوئے تھے ۔ انہوں نے مفاد پرست ، تنگ نظر اور بزدل ملّا ، مولوی ، مفتی اور پیر و مہنتوں کی قلعی کھول دی ۔ دراصل ان کے دل میں مذہب کا پورا احترام تھا اس میں مذہبی کوتاہیاں ضرور تھیں ۔ مگر انہوں نے کچھ ایسا نہیں کہا ، جس سے اپنے مذہب کو ٹھیس لگے ۔ انھیں ان نکتہ چینیوں سے صرف مفاد پرست مذہبی رہنماؤں کی بے رہروی کا اظہار کرنا مقصود تھا ۔ ایک دفعہ ایسے ہی مذہبی رہنماؤں کی عیاری اور چالبازیوں سے تنگ آکر اقبال بھی بول اٹھے ۔

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیّاری ہے ، سلطانی بھی عیّاری

نذرالاسلام نے اپنی شاعری میں قرآن اور پُران کو پہلو بہ پہلو رکھ کر اسلامی اور غیر اسلامی تہذیب و تمدن کی ترجمانی کی ہے ۔ مسلمانوں کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کے خیالات و تصورات کو بھی پیش کیا ہے ۔ کہیں فرشتوں کا ذکر کیا ہے تو کہیں دیوتاؤں اور دیویوں کا بھی راگ الاپا ہے ۔ اس سے ان کی مذہبی عقیدت پر کوئی حرف نہیں آتا ۔ اس لئے کہ وہ ایک شاعر تھے ۔ ان کا تعلق ادب سے تھا ۔ یہ بدیہی بات ہے کہ ماحول ، معاشرہ اور زمانے کے تقاضوں سے بے نیاز ہو کر کوئی ادب وجود میں نہیں آسکتا اگر آئے بھی

تو وہ ادھورا رہ جاتا ہے۔ ادب زمانے کی تاریخ اور عوام کے جذبات و احساسات اور تہذیب و تمدن کا ترجمان ہوتا ہے۔

نذرالاسلام پاک و ہند میں پیدا ہوئے۔ اس سرزمین میں ہندو بھی بستے ہیں۔ اور مسلمان بھی۔ لہٰذا ان دونوں فرقوں کی ذہنیت اور تہذیب و تمدن کی عکاسی کرنا ان کا فرض تھا۔ انہوں نے اس ادبی اور اخلاقی فریضہ پر عمل کیا۔ قرآن کے پہلو بہ پہلو پُران کو بھی مدنظر رکھا اس کے سوا ان کے لئے کوئی چارہ کار بھی نہ تھا۔ ہندوؤں کو نظر انداز کر کے مسلمانوں کے لئے ادب پیدا کرنا یا مسلمانوں کو نظر انداز کر کے ہندوؤں کے لئے ادب پیدا کرنا ان کے لئے ناممکن تھا۔ کیونکہ وہ انسانیت کے شاعر تھے۔ انسانیت کی ترقی و تکمیل ان کی منزلِ مقصود تھی ـــــ!

اقبال کو دیکھئے ــ ان کی شاعری اسلامی تہذیب و تمدن کے لئے وقف ہے۔

رابندر ناتھ کو دیکھئے ــ ان کی شاعری میں ہندو تہذیب و تمدن کی کارفرمائی ہے۔

ہاں نذرالاسلام بنگلہ ادب کے پہلے شخص ہیں جن کی شاعری میں دو قومی نظریہ کا تصور ملتا ہے۔ جنہوں نے مسلمان اور غیر مسلمان کو الگ الگ قوم قرار دیا۔ دونوں کے لئے الگ الگ مذہبی نظمیں لکھیں۔ اور دونوں میں زندگی کا ولولہ پیدا کیا۔ مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔

ہم اسی ملت کے افراد ہیں ـــ
جو مذہب کی راہ میں شہید ہوتے ہیں۔ ہم وہی ملت ہیں۔
ہم ہی مساوات اور میل محبت کو وجود میں لاتے ہیں۔
ہمیں لوگوں نے ساری دنیا کو اپنا سمجھا ہے۔
ـــ ہم وہی ملت ہیں۔

(تبلبُل)

اس طرح انہوں نے پُران میں بیان کئے ہوئے شجاعت و بسالت کے مختلف واقعات

کی طرف ہندوؤں کی توجہ منعطف کر کے ان میں ہمت و حوصلہ پیدا کرنے کی کوشش کی ۔ انھوں نے اپنی شاعری میں دیوتاؤں اور دیویوں پر کچھ لکھا بھی ہو تو اس سے ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ان کو ہندو مذہب سے عقیدت تھی ۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کا دل مذہب اسلام کی محبت سے معمور تھا۔ جب ہی تو اسلام کو خطرے میں دیکھ کر ان سے رہا نہ گیا ۔ ان کی زبان سے یہ پُر جوش الفاظ نکلے :۔

اے مسلمانو ! تم آجاؤ !

وہ دیکھو اسلام ڈوب رہا ہے ۔

میرے خیال میں نذرالاسلام نے کہیں ایسا نہیں کیا کہ اے ہندوو ! ہندو مذہب ڈوب رہا ہے ۔ تم آجاؤ ۔ البتہ سیاست کے مشترکہ مفاد میں انھوں نے دونوں فرقوں کو ایک ہی نگاہ سے دیکھا۔ یکساں دونوں کے جذبات و احساسات کی آئینہ داری کی ۔ ملک کو آزاد کرنا اور ظلم و ستم کا خاتمہ کر کے اس میں خوشحالی قائم کرنا ہی ان کا نصب العین تھا ۔ اس لئے مذہب سے قطع نظر کر کے انھوں نے ملک کے کل عوام میں سیاسی اور سماجی بیداری کی روح پھونکنے کی کوشش کی ۔

عرصۂ دراز تک برطانوی سامراج کے دباؤ سے پاک و ہند کے عوام کا سیاسی، سماجی اور اقتصادی شعور ختم ہوتا جا رہا ہے ۔ ایسے نازک وقت میں مذہبی جذبہ کو بیدار کرنے کے سوا ملک اور قوم کو جگانے کی کوئی اور صورت نہ تھی ۔ اسی خیال سے اس وقت کے سیاسی سربراہوں نے بھی تحریکِ خلافت کا نعرہ لگا کر کے مسلمانوں میں بیداری کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی تھی ۔ نذرالاسلام نے بھی صورت حال کو بھانپ لیا کہ مذہبی جذبات کو بیدار کئے بغیر عوام میں سیاسی اور سماجی بیداری پیدا کرنا مشکل ہے ان کو خوب معلوم تھا کہ مشرقی ممالک کے لوگ مذہب کے نام پر مر مٹ سکتے ہیں ۔ اسی لئے مذہبی بیداری کے ذریعے عوام میں آزادی کا خون دوڑانا زیادہ آسان ہے ۔ اس طریقہ کار پر انھوں نے عمل بھی کیا ۔ اور اپنی شاعری سے ہندو اور مسلمان، دونوں کو مذہبی جذبات سے

سرشار بنا کر انھیں جنگِ آزادی کے میدان میں لا کھڑا کیا۔ انہوں نے پُران کے واقعات یاد دلا کر ہندوؤں کو سامراج اور ظلم و ستم کے خلاف کیسے اکسایا ہے۔ اس کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

میں پُر شور رام کی سخت کلہاڑی ہوں۔
میں دنیا کو شاہنشاہیت سے پاک کروں گا۔
اور ہمہ گیر امن و امان قائم کروں گا

(بدروہی)

ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہذیب و تمدن کی اس ترجمانی کے ساتھ نذر الاسلام کا مذہبی رشتہ جوڑنا اور یہ کہ ان کا کوئی خاص مذہب ہی نہیں یا ان کو ہندو مذہب سے دلی عقیدت تھی۔ یا یہ ترجمانی ان کی ایمانی کمزوری کی دلیل ہے بیجا نہ ہوگا۔ اس لئے کہ اسلام صرف مسلمانوں کے لئے وجود میں نہیں آیا بلکہ پوری دنیا کی سالمیت، بنی نوع انسان کی نجات اور انسانیت کو فروغ دینے کے لئے آیا ہے۔ نذر الاسلام نے ہندوؤں کے مذہبی جذبات سے فائدہ اٹھا کر ان میں آزادی کی لہر دوڑا دی، تو اس سے ان کے اپنے مذہب پر کوئی آنچ نہیں آتی۔ بلکہ یہ ان کی وسیع النظری اور انسان دوستی کی دلیل ہے۔

اقبالؔ نے جبریل اور ابلیس کے مکالمے میں ابلیس کا ایک نمایاں کردار پیش کیا اور اسے سرگرمیوں کا مجسمہ قرار دیا۔ جبریل کے جواب میں ابلیس کہتا ہے :-

دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر
کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے؟ میں کہ تو؟
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو؟
میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ھُو اللہ ھو اللہ ھُو

اس سے مطلب یہ تھوڑا ہی نکلتا ہے کہ اقبالؔ ابلیس کی متکبرانہ اور کافرانہ خودی کے قائل ہیں۔ نعوذ باللہ! انہیں تو صرف اس کی جد و جہد اور سرگرمیوں کا اظہار کرنا مقصود

تھا۔ انہوں نے نادر شاہ، نپولین اور مسولینی پر نظمیں لکھ کر خراجِ عقیدت پیش کیا تو اس کی بنا کر یہ کہنا ہرگز مناسب نہ ہوگا کہ وہ نادر شاہ کی تاخت و تاراج کو بھی پسند کرتے ہیں یا نپولین یا مسولینی کے مذہب سے بھی عقیدت رکھتے ہیں۔ ان کا روئے سخن صرف ان کی خودی عمل، ہمت اور شجاعت کی طرف تھا بنابریں قیاس اگر نذرالاسلام نے کہیں کہیں شو پر شورام یا بلرام وغیرہ کی شجاعانہ تصویریں پیش کی ہوں تو اس سے ان کے مذہب یا عقیدت کو کوئی سروکار نہیں۔

نذرالاسلام کے متعلق مشرقی پاکستان کے شاعر نذرالاسلام نے کہا۔

وہ نبی کریمؐ کے بے لوث معتقد اور تابعدار ہیں
مجاہد ــــ نذرل اسلام کی ایک قابلِ صد احترام تصویر ہیں

ـــــ ـــــ ـــــ نذرالاسلام

نذرالاسلام شروع سے لیکر آخر تک ایک مسلمان اور سچے مسلمان ہیں ان کا جذبہ مجاہدانہ ہے۔ وہ عمل اور کردار کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک کمزوری گناہ ہے۔ کمزور مومن کامل نہیں ہو سکتا۔ رسولِ کریم صلعم نے فرمایا :-

قوی مسلمان ضعیف مسلمان سے بہتر ہے۔

اقبالؔ نے بھی یہی بات سنائی کہ کمزوری جرم ہے۔ کمزور زندہ نہیں رہ سکتا

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

ـــــــ ـــ اقبال

یہی وجہ ہے کہ نذرالاسلام مسلمانوں کی ظاہر داری کے سخت مخالف تھے۔ ان کے نزدیک وہ مذہب بے معنیٰ ہے جو بے جان ہو جس سے انسانیت کو کوئی فائدہ نہ پہنچے۔ وہ مسلمان، مسلمان ہی نہیں جو کمزور اور جوشِ ایمان سے بے بہرہ ہو۔ انہوں نے بے جان، بے عمل مسلمانوں کی ظاہر داری اور ریاکاری کا پول اس طرح کھولا۔

درختِ مسلم کو جتنا بھی ہلاؤ، اس سے سوائے
داڑھی، شیروانی، جبہ، تسبیح اور ٹوپی کے کچھ نہیں گرے گا۔
(خالد از نخر)

اقبال بھی بے جان، بزدل، پست ہمت اور بے عمل ملاؤں اور فقیہوں سے بیزار تھے۔ انہوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ نام نہاد ملاؤں اور فقیہوں کی عبادت میں روح نہیں ہے۔ وہ قوم اور قوم کی امامت کے راز سے ناواقف ہیں۔ یوں تو وہ خدا کے آگے سر جھکاتے ہیں مگر دراصل ان کے دل صنم آشنا ہیں۔ ان کی نماز اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ (بے شک نماز فحش اور برائی سے روکتی ہے)۔ کے مصداق نہیں۔ فرماتے ہیں :

آہ! اس راز سے واقف ہے نہ ملّا نہ فقیہہ
وحدتِ افکار کی بے وحدتِ کردار ہے خام
قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

نذرالاسلام نرے مذھبی رہنما سے قومی سپوت کا زیادہ احترام کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی نظم خالد میں حضرت خالدؓ سے یوں خطاب کیا۔

خدا کے حبیب محمدؐ فرما گئے کہ مسیح اور مہدیؑ پھر دنیا میں
نازل ہوں گے۔
اے بہادر (خالد) میری خواہش ہے کہ تو ہی ہاتھ میں تلوار لئے
پھر آجا۔

نذرالاسلام نے اپنی عقیدت و مذہب کے متعلق خود اپنا تعارف کرایا۔ فرماتے ہیں

اللہ میرا رب ہے پھر مجھے کیا خوف
محمدؐ صلعم میرے نبی ہیں۔ جن کی دنیا بھر میں ثنا خوانی ہو رہی ہے۔

مجھے کیا ڈر ہے!
قرآن میرا ڈنکا ہے
اسلام میرا مذہب ہے ۔ اسلام ہی میری پہچان ہے

کلمۂ طیبہ میری تعویذ ہے ۔ توحید میرا مسند ہے
ایمان میری درہ ہے ۔ ہلال میری ضیا ہے
نعرہ اللہ اکبر

میرا اعلان جہاد ہے
میری منزلِ مقصود آسمانوں کا وردِ مبین ہے

عرب ہو یا مصر، چین ہو یا ہند سارا جہاں میرا کھاف ہے
کوئی اعلیٰ اور کوئی ادنیٰ نہیں یہاں سب ہی برابر ہیں ۔
مختلف قالبوں میں ایک ہی روح کارفرما ہے
امیر اور فقیر برابر ہیں ۔
میں یک تکبیر جاگ اٹھتا ہوں ۔ میری کامیابی یقینی ہے ۔

(ذوالفقار)

واقعی نذرالاسلام کے الفاظ ـــــ ایک ہی تکبیر سے جاگ اٹھتا ہوں ، میری کامیابی ہے ۔ سچ نکلے ۔ وہ خود بھی جوشِ ایمان لیے ہوئے جاگ اٹھے اور ان کی جرأت مندانہ اور مجاہدانہ تکبیر سے سرزمین بنگال کے مسلمان بھی جاگ اٹھے ۔ ان کے تنِ نازک میں شاہین کا جگر پیدا ہوا ۔

نوا پیرا ہو، اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا! (اقبال)

عوام میں خود داری اور حرکت و عمل کا جذبہ پیدا ہوا۔ سیاسی اور سماجی شعور بیدار ہوا۔ مولانا محمد علی اور شوکت علی مرحوم کی قیادت میں خلافت کی جو تحریک شروع ہوئی تھی۔ اس میں مسلمان نوجوان جوق در جوق کود پڑے۔ مسلمانوں کی اس بیداری کو دیکھ کر شاعر مسرت بھرے جذبات میں بول اٹھا۔

کیا پھر شبستان کے اندھیرے میں
صبح کی شہنائی بج اٹھی ہے ؟
آخری شب کو مینار کی چوٹی سے
دیر آسمان آوازِ اذان سن رہا ہوں۔
کیا قافلے کے مسافروں نے 'دوستو جاگ اٹھو۔
کی آواز بلند کی ہے۔ ؟
کیا صبح کے پرندے اپنے اپنے آشیانے چھوڑ کر
باغوں کی طرف پرواز کرنے لگے ہیں۔ ؟
کیا پھر آج صبح سے کعبے کی راہ پر
ہجوم ہونے لگا ہے۔ !
کیا پھر حرا سے نور کے ہزاروں دھارے
دنیا بھر میں بہنے لگے !
کیا خالد، طارق، موسیٰ
خون سے رنگین حلے پھر لائے !
نئے بلال کے شیریں سُر سے
حسین صبح پھر نمودار ہوئی ہے۔ !
کیا پردیسی اور بدیسی زائرینِ کعبہ
عرفات میں جمع ہونے لگے ہیں !

کیا پھر کوہِ طور پر ضابطۂ لاشریک لہٗ
کا طوفان اُمڈا ہے!
کیا بہادر شہیدانِ کربلا اجلی پھر کرحیاتِ جاوید لئے ہوئے آگئے:
آج نوجوانی کے سُرخ لہو سے زمین و آسمان روشن ہو گئے!!

ساری مسلم دنیا میں بیداری اور انقلاب کا جذبہ دیکھکر نذرالاسلام نے خوشی محسوس کی اور اس کی ایک جیتی جاگتی تصویر اپنی شاعری میں پیش کی۔ اس کو یقین ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کا عہد تاریک گذر چکا ہے اب ایک روشن مستقبل اس کے سامنے ہے۔ انہیں پھر اپنی پرانی شان و شوکت نصیب ہوگی۔ ساری دنیا کے مسلمان پھر آزاد ہو جائیں گے۔ شاعر نے گایا:-

دیکھو آج عید گاہِ شہادت میں جماعت بھاری ہوئی ہے
پھر دنیا میں اسلامی فرمان جاری ہوگا۔
توران، ایران، حجاز، مصر، ہند، مراکش اور عراق
شانہ بشانہ صف باندھے کھڑے ہو گئے ہیں۔
جو اب تک آنسو اور افسوس لئے ہوئے بیہوش پڑے تھے۔
وہ بھی فردوس کے آرزو مند ہو گئے اور نیا جوش لئے ہوئے جاگ اُٹھے ہیں
تو بھی اس جماعت میں آجا، دنیا داری بھول جا۔
جو زندان میں تھے، وہ آج فراخ دل اور نئی توانائی لے کر
شمشیر لئے ہوئے میدان میں کود پڑنے لگے۔
تقدیر بدل گئی ہے، آج ان کے نعرہ ہائے تکبیر بلند ہونے لگے ہیں
(ذوالفقار)

اسلامی ممالک کی اٹھان دیکھکر اقبال بھی پھڑک اٹھے۔ انہوں نے ان الفاظ میں مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کی

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
اُفق سے آفتاب اُبھرا، گیا دورِ گراں خوابی
عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی
عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی
سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا!

سرزمین بنگال میں مسلمانوں کی آزادی کے خواب دیکھنے والے نذرالاسلام کا خواب آج شرمندۂ تعبیر ہوا۔ پاک و ہند کے مسلمانوں کو آج صرف آزادی ہی نہیں ملی۔ انہیں ایک آزاد وطن ـــ پاکستان بھی ملا۔ لہٰذا ہم کہیں گے کہ نذرالاسلام ہمارے قومی شاعر ہیں۔

نذرالاسلام اور بچوں کا ادب

نذرالاسلام نے بچوں کے لیے جو نظمیں لکھی ہیں، وہ بنگلہ ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ وہ زندگی بھر بچے ہی رہے۔ ان کی فطرت ہمیشہ بچوں کی طرح رہی۔ بچوں کی طرح ہنستے کھیلتے زندگی گذار دی۔ شاعر غلام مصطفیٰ نے ان کی فطرت کی تصویر یوں کھینچی ہے۔

ایک مدت میں قاضی نذرالاسلام
کے گھر پر گیا
دیکھا کہ بھیا اچھلتے کودتے ہیں
رات دن بس ہنسی خوشی گائے جاتے ہیں
دل میں خوشی موجزن ہے
دنیا میں کوئی ان کا پرایا نہیں

وہ بچوں کی نفسیات سے پوری طرح واقف تھے۔ انہوں نے بچوں کے لئے جو نظمیں لکھی ہیں، وہ بچوں کی نفسیات کے مطابق اور ان کی ذہنی نشوونما کیلئے سازگار ہیں۔ انہوں نے بچوں میں جوانمردی، حب الوطنی اور ایثار نفسی کی روح پھونکنے کی کوشش کی۔ ان کو اس بات کا اچھی طرح احساس تھا کہ قوم کے نونہال اس کی ریڑھ کی ہڈی ہیں۔ ان پر قوم و ملک کا مستقبل موقوف ہے۔ اس لئے انہوں نے بچوں سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ رکھیں اور ان میں صحت مندانہ ذہنیت اُبھارنے کی تدبیر سوچی۔ ان کی تعمیری اور حوصلہ افزا نظموں میں "سات بھائی چمپا" کی نظمیں مقبول عام ہیں۔ یہ نظمیں بچوں کی نصاب میں رکھی جاتی ہیں۔ بچے انہیں نہایت ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں اور رٹ رٹ کر ازبر کر لیتے ہیں — شاعر نے جدید نفسیات کے مطابق خشک اخلاقی سبقوں سے بچوں کے ننھے دل و دماغ کو بوجھل

ہمیں کیا ملکہ کبھی رومانیت، کبھی چشم دید واقعات پر رنگ چڑھاکر اور کبھی الفاظ کی دلکش صوتی کیفیت سے ان کی دلچسپی بڑھانے کی کوشش کی۔ سات بھائی چمپا سے ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے:-

میں سوداگر ہوں سات سمندر پار روانہ ہوں گا۔
سات سمندر میں میرے جہاز چلتے پھرتے نظر آئیں گے
میں اپنا مالِ تجارت لے کر تمام بندرگاہوں کا دورہ کروں گا
ساری دنیا کی منڈیوں میں میری خرید و فروخت کا سلسلہ جاری رہیگا۔
(سات بھائی چمپا)

میں چار دیواری میں اور نہیں رہوں گا۔ اب دنیا کو دیکھوں گا۔
مجھے دیکھنا ہے کہ کس طرح انسان زمانے کی گردشوں کے ساتھ
ساتھ چکر لگا رہا ہے۔
کس طرح وہ ملک ملک گشت لگا رہا ہے
کس امید پر اور کیسے لاکھوں بہادر مر مٹ رہے ہیں۔
کس امید پر وہ موت کی سختی قبول کر لیتے ہیں۔

علاوہ ازیں شاعر نے بچوں کی ذہنی نشاط و انبساط کے لئے بہت سی مزاحیہ نظمیں بھی پیش کی ہیں۔ اس سلسلے میں پنچو چور، کنٹھ بڑالی، کھاندو را دو ٹھینگ، بھولی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

= - — ===

نذرالاسلام کی شاعری میں
عربی، فارسی اور اردو الفاظ کا استعمال

قدیم بنگلہ اور اردو

نذرالاسلام کے زبان وادب کے مطالعے سے قدیم پوتھی ادب کی تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب بنگال میں پوتھی ساہتیہ کا دور دورہ تھا۔ کہنے کو تو وہ ادب ایک الگ نام ــــ پوتھی ادب سے موسوم تھا۔ مگر اس کی زبان فارسی اور اردو سے بہت قریب تھی۔ فارسی اور اردو کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ بنگال کے حکمراں حسین شاہ اور نصرت شاہ وغیرہ کے عہد کے بنگلہ ادب پر نظر ڈالیں، تو اس کے سیکڑوں ہزاروں عربی، فارسی اور اردو الفاظ کی روشنی میں اسلامی تہذیب وتمدن، اسلامی جذبات احساسات اور قدیم مسلمانوں کی شجاعت وحمیت کا نقشہ ہماری نگاہوں میں پھر جاتا ہے۔

پوتھی ادب کا دور

پوتھی ادب کا ایک معتدبہ حصہ عربی رسم الخط میں لکھا جاتا تھا اور بائیں سے دائیں طرف لکھا جاتا تھا۔ عربی رسم الخط میں لکھے ہوئے بنگلہ ادب کا ایک قابل قدر سرمایہ اب بھی موجود ہے۔ پوتھی ساہتیہ کی زبان نہایت سادہ مگر پُرکیف تھی۔ یہ مقامی بولیوں سے بہت قریب تھی۔ اس زبان و ادب پر اسلامی تہذیب وتمدن، اور اسلامی روایات و ثقافت کا نمایاں اثر تھا۔ خلاصتہ الانبیاء، حاتم طائی، شاہنامہ، امیر حمزہ، قصص الانبیاء، جنگ نامہ، تذکرۃ الانبیاء، شہادت نامہ جیسی پوتھیاں اس کا ثبوت ہیں۔ ان پوتھیوں کا کوئی صفحہ شاید ہی ایسا ہو جس میں عربی و فارسی اور اردو کے دس بیس الفاظ نہ ہوں۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

خلاصتہ الانبیار
حاتم طائی
شاہنامہ
امیر حمزہ

} مصنف نے یہاں بنگالی زبان کے اقتباسات دئے ہیں

مذکورہ بالا اقتباسات میں عربی، فارسی اور اردو الفاظ ـــــ خلاصتہ الانبیار۔ کتاب، بی، تمام سیر، قلم نام، الہٰی، شروع، وصدت، حق، قرار، سوال، قصتہ، تمام گھوڑا، میرا، توڑنا، لگام، طرف، مردانہ، روانہ، اولاد، راہداری، راہ، سوار، بادشاہ، بیٹی، مہربگار، عاشق، سہیلی، زار زار، امیر اور بات پر غور کیجئے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ زبان اردو سے کتنی قریب تھی۔

مگر زمانے کا الٹ پھیر ہے کہ یہ زبان کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔ ہندوؤں اور انگریزوں کی کارسازیوں نے اس کا چہرہ مسخ کردیا۔ انھوں نے اسلامی بنگلہ کو ایک ہندو بنگلہ بنانے کے لئے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ ہندوادیبوں اور شاعروں نے بوتھی ساہتیہ کی سیدھی سادی اور لوچ دار زبان میں نہ صرف سنسکرت کے بھاری بھرکم الفاظ ٹھونس دئیے بلکہ ان شاہِ قلم کے پجاریوں نے اس میں ہندو مذہب کے جذبات وخیالات اور غیر اسلامی تصورات وتخیلات کی روح پھونک کر اسے اپنی بنیادی خصوصیات سے بیگانہ بنادیا۔ اُسے سنسکرت کی متنیٰ بیٹی بناکر اس کی رفتار پر بار عظیم ڈالا۔ انھوں نے اس چہیتی زبان کے چہرے کو اس قدر بگاڑ دیا کہ موجودہ سنسکرت نما بنگلہ اور پوتھی ساہتیہ کو پہلو بہ پہلو رکھ کر ان پر نگاہ ڈالی جائے تو دونوں میں بہت بڑا فرق نظر آئے گا۔ سنسکرت کی اس انا پ شناپ تقلید سے بنگلہ اور اردو جو ڈیڑھ سو یا دو سو سال پہلے دو مماثل اور قریب تر زبانیں تھیں وہ اس قدر کترا گئی ہیں کہ اب غیر بنگالیوں کو اگر بنگلہ سیکھنے کی ترغیب دی جائے تو ان میں اکثر اسے بیگانہ زبان سمجھ کر ہچکچانے لگتے ہیں۔ دوسری طرف بنگالیوں کو اردو سیکھنے کی ہدایت دی جاتی تو

اس میں بھی بہت لوگ اسے مادرِ عظیم خیال کرتے ہیں ۔

نذرالاسلام اور بنگلہ زبان کا احیا روپ ۔

مسلمان گھرانوں کے سیکڑوں عربی، فارسی اور اردو الفاظ جو کئی صدیوں سے بنگلہ ادب میں مستعمل تھے اور حکومت برطانیہ کے عہد میں فورٹ ولیم کالج کے ہندو پنڈتوں کی دست برد سے صفحۂ ادب سے روپوش ہو کر گھر کے گوشوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے تھے، وہ دوبارہ نذرالاسلام کے زبان و ادب میں آب و تاب کے ساتھ رونما ہوئے ۔ سہراب و رستم، جنگ نامۂ ابوحنیفہ اور امیر حمزہؓ کے ورق ورق میں درج کئے ہوئے قدیم مسلمانوں کی دلاوری اور بہادری کے جو نقوش ہیں، بنکم اور نبین کی سادھو بھاشا سے راندۂ بارگاہ ہو کر دیہاتوں میں گائی جانے والی پوتھیوں میں اپنا دم توڑ رہے تھے، وہ یکا یک نذرالاسلام کی آمد کے ساتھ ساتھ بنگلہ ادب میں حیات تازہ لے کر چمک اٹھے ۔

بنگلہ، حکومتِ برطانیہ سے پہلے ۔

زیادہ واضح لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ عہدِ برطانیہ سے قبل سرزمین بنگال کی گوڑ کی زبان کو مرکزیت حاصل تھی ۔ ملک بھر کے زبان و ادب پر گوڑی زبان کی چھاپ تھی ۔ اور وہ زبان ہیم، بنکم اور نبین کی زبان سے بہت مختلف تھی ۔ گوڑی زبان پوتھی ادب کا ذریعہ بیان تھی ۔ اسی زبان میں بھارت چندر جیسے پنڈت نے بھی شعر و شاعری کی تھی ۔ جدید بنگلہ ادب میں کسی کو اس کا نمونہ دیکھنا ہو تو اسے پیاری چاند کی کتاب "آلالیر گھرے دلال" (۱۸۵۸ء) پر نظر ڈالنی چاہئے ۔ پوتھی ادب کی زبان کو مسلمان حکمرانوں نے پانچ سو سال تک پال پوسا اور پروان چڑھایا ۔ حسین شاہ اور نصرت شاہ نے اسی زبان کی سرپرستی کی تھی ۔ شاعر علاول اور دولت قاضی نے اسی زبان میں شاعری کی تھی ۔ اسی زبان میں دلیلیں اور دستاویزیں بھی لکھی جاتی تھیں ۔ مگر افسوس کا مقام یہ ہے کہ اٹھارویں صدی عیسوی کی ابتدا سے لے کر سوا سو سال تک سنسکرت اثرات نے پوتھی ادب کی زبان کا چہرہ مسخ کر رکھا تھا ۔ بنگال کی اصلی زبان نے اپنی اصلی شکل و صورت کو کھو کر سنسکرت کا رنگ روپ دھار لیا تھا

بظاہر یہ خیال ہوتا تھا کہ بنگلہ زبان سنسکرت ہی کی بیٹی ہے۔ حالانکہ وہ نہ سنسکرت ہے اور نہ سنسکرت کی بیٹی۔ بلکہ وہ سرزمین بنگال کے قدیم باشندوں کی اصلی زبان ہے۔

حکومتِ برطانیہ کی سرپرستی میں فورٹ ولیم کالج کے ہندو پنڈتوں نے پوتھی ادب کی زبان کو بدلنا شروع کیا۔ جن کی تنگ نظری کی وجہ سے قدیم اور اصلی زبان کا چہرہ مسخ ہوکر رفتہ رفتہ سنسکرت نما ہوتا گیا۔ آخر اس زبان کا نام "سادھو بھاشا" قرار پایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پوتھی ادب کی زبان نے اسکولوں اور مدرسوں سے رخصت ہوکر گھروں میں پناہ لے لی۔ مدت دراز تک صرف ہندو ہی نہیں بلکہ مسلمان اہلِ قلم بھی قدیم اصلی زبان سے احتراز کرتے رہے اور اس مصنوعی زبان کو اپنی زبان سمجھتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ 'سادھو بھاشا' کا دور دورہ ہوگیا اور بنگال کی اصلی زبان کو بحال کرنے کا جذبہ لوگوں کے دل سے مٹتا گیا۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

آخر خوش قسمتی سے زبان کی تاریخ میں ایک موڑ آیا۔ بنگلہ ادب کے افق پر نذرالاسلام طلوع ہوئے اور پوتھی ادب کی روپوش شدہ زبان نے نشاۃ الثانیہ کا منھ دیکھ لیا۔ بے شک اس سے پہلے بھی ستیندر ناتھ اور موہت لال نے بنگلہ ادب میں عربی و فارسی الفاظ کا استعمال کیا تھا مگر وہ استعمال اتنے وسیع پیمانہ پر نہ تھا جتنا کہ نذرالاسلام کا ہے۔ ستیندر ناتھ اور موہت لال نے موقع محل کے لحاظ سے مسلمانی ماحول پیدا کرنے کے لئے عربی و فارسی الفاظ کا استعمال کیا نہ کہ اسلامی تہذیب و تمدن کی ترجمانی کے لئے ستیندر ناتھ اکثر اوزان اور بحور پر رنگ چڑھانے کے لئے ایسے الفاظ کا استعمال کرتے تھے۔ مگر نذرالاسلام نے حسن صوری سے زیادہ حسن معنوی اور فصاحت سے زیادہ بلاغت پیدا کرنے کے لئے عربی و فارسی الفاظ کا استعمال کیا ہے۔

مشرقی پاکستان میں بنگلہ زبان کا نیا رجحان۔

حصولِ پاکستان کے بعد مشرقی پاکستان میں بنگلہ زبان و ادب کا جو نیا رجحان نظر آتا

ہے ، اس کے بانی دراصل نذرالاسلام ہیں اب مشرقی پاکستان میں ۔ بنگلہ زبان کا جو ڈھانچہ بن رہا ہے ، وہ مغربی بنگال کی زبان سے بہت مختلف ہے ۔ مغربی بنگال کی زبان اپنی پرانی رفتار اور پرانے رنگ و آہنگ پر قائم ہے ۔ دوسری طرف مشرقی بنگال کی بنگلہ اپنی پرانی کینچلی بدل کر نئے چولے اور نئی روح کے ساتھ دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے ۔ اب سنسکرت کے اثرات مٹ کر اس میں اسلامی تہذیب و تمدن کا رنگ جھلکنے لگا ہے ۔ ایشور بھگوان، دیوتا، سرگ، نرک، آشیرباد، جل، اسمان وغیرہ کی جگہ اللہ، خدا، فرشتہ، بہشت، دوزخ، دعا، پانی، غسل وغیرہ کا استعمال ہونے لگا ہے ۔ بلاشبہ اس تبدیلی اور نئے رجحان کا سہرا نذرالاسلام کے سر باندھا جائے گا ۔

نذرالاسلام کی زبان پر اسلامی ماحول کا اثر ۔

جدید بنگلہ ادب میں وسیع پیمانہ پر عربی و فارسی اور اردو الفاظ کا استعمال نذرالاسلام ہی کے ساتھ شروع ہوا ۔ ان کی پیدائش ایک مسلمان گھرانے میں ہوئی ۔ ان کے والد قاضی فقیر احمد ایک بزرگ آدمی تھے وہ اردو اور فارسی سے کم و بیش واقف تھے ۔ نذرالاسلام کو گھر ہی میں اپنے والد سے عربی و فارسی سیکھنے کا موقع ملا ۔ علاوہ ازیں ان کے چچا قاضی نذل کریم فارسی ادب کے بڑے ماہر تھے ۔ وہ اردو اور فارسی نما غزلیں لکھتے اور گایا کرتے ۔ نذرالاسلام نے ابتدائی عمر میں ان سے بھی فارسی پڑھی ۔ اور ان کی دیکھا دیکھی عربی و فارسی آمیز بنگلہ زبان میں طبع آزمائی بھی کی ۔ نذرل کے زمانے میں ان کے پیدائشی مقام چرلیا اور راڑھ کے دیگر حصے علاقوں میں لیٹو ناچ کے نام سے ایک قسم کا جاترا گان رائج تھا ۔ تنگدستی کا شکار ہو کر گیارہ سال ہی کی عمر میں ان کو لیٹو ناچ سے منسلک ہونا پڑا ۔ اس سلسلے میں انہیں بہت سے منظوم ناٹک اور گیتوں کی بھی تصنیف کرنی پڑی اس زمانے میں دیہاتی گیتوں خاص کر کے مرشدی اور زاری گیتوں میں عربی و فارسی کے الفاظ کثرت سے استعمال کئے جاتے تھے ۔ نذرالاسلام کو بھی رائج الوقت طرز کو اختیار کرنا پڑا ۔ اس مخلوط زبان کا اثر ان کی ابتدائی نگارشات پر تو پڑا ہی تھا ۔ علاوہ ازیں ان کی شاعرانہ زندگی کے ہر دور خصوصاً آخری دور

کے کلام پر نمایاں طور پر پڑا۔ انہوں نے فارسی اختیاری زبان کی حیثیت سے لی اور فارسی کے ماہر استاد حافظ نورالنبی صاحب سے اس کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران 'بنگالی پلٹن' میں فارسی کے ماہر ایک پنجابی مولوی صاحب سے نذرل کی ملاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے مولوی صاحب سے دیوان حافظ، مثنوی مولانا رومؒ اور فارسی کی دوسری کتابیں پڑھیں۔ غرض انہیں عربی، فارسی اور اردو سے واقفیت حاصل کرنے کا بارہا موقع ملا۔ اور ان تعلیمات کے اثر سے عربی و فارسی کے سینکڑوں ہزاروں الفاظ ان کی زبان میں شیر و شکر ہوگئے۔

عربی، فارسی اور اردو الفاظ کا برمحل استعمال۔

نذرالاسلام عربی و فارسی کے الفاظ کو استعمال کی خاطر استعمال نہیں کرتے بلکہ جو مروجہ الفاظ ان کی زبان کا جز و بن گئے تھے، انہیں کو وہ استعمال میں لاتے۔ یہ الفاظ دیگران کا استعمال آمد تھا، آورد نہ تھا۔ وہ قلم برداشتہ لکھتے جاتے اور برجستہ گاتے جاتے اور عربی فارسی اور اردو الفاظ ان کے نوکِ قلم سے صفحۂ قرطاس پر اس طرح ٹپک پڑتے کہ معلوم ہوتا ہے اسی سرزمین ہی کے لئے وہ پیدا ہوئے تھے۔ پھر بھی انہیں ایسے الفاظ کے استعمال میں موقع و محل کا لحاظ ضرور ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں غیر اسلامی ماحول کی بہ نسبت اسلامی ماحول ہی میں عربی و فارسی الفاظ کا استعمال زیادہ نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی نظم عید مبارک، نورور، فاتحہ دوازدہم، محرم، الوداع، کمال پاشا وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ یہاں یہ بات سن لینا مناسب ہوگا کہ نذرالاسلام نے عربی و فارسی الفاظ کا استعمال نثر میں بہت کم ہی کیا ہے۔

نذرالاسلام نے عام طور پر عربی و فارسی کا استعمال ایسی خوبی سے کیا ہے کہ اس سے عبارت کی روانی، سامعہ نوازی اور جھنکار کی کیفیت دوبالا ہو جاتی ہے۔ ان کی نظم محرم کی دو سطریں ملاحظہ ہوں

لال سپاہ آسماں لالِ لال دنیا
اماں لال تیری خون کیا خونیا"

سیلا آسمان لال ہو گیا ہے۔ پوری دنیا سرخ ہو گئی ہے

اے اماں! تیرے لال کو کس خونی نے خون کر دیا ہے؟

یہاں ایک لفظ بھی بنگلہ کا نہیں۔ دوسری سطر کو بنگلہ کے بجائے اردو کہا ہی مناسب ہوگا۔ عربی و فارسی کے الفاظ نے عبارت میں کوئی کرختگی پیدا نہیں کی بلکہ انہوں نے اس کی خوبی میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔

شاعر کے ابتدائی کلام کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیے ـــ اور بنگلہ الفاظ کے ساتھ ساتھ نشان دادہ عربی و فارسی کے الفاظ، ان کی ساخت اور ان کی ترکیبوں پر غور کیجئے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ان کا ابتدائی ادب پوتھی ادب سے کتنا قریب تھا۔

نذرالاسلام بولے بھائی کروبندگی

کھوائیونا آخر غم گنا ہیئے زندگی

شرمندگی ہوئے حشر بزما بجھے

مسلمان گھرانوں کی روزمرہ زندگی میں عربی، فارسی اور اردو کے سینکڑوں ہزاروں الفاظ مثلاً غسل، چراغ، پانی، مہمان، میزبان، شطرنجی، برتن، کتاب، دعا، مناجات شیرینی مستعمل ہیں، جو عام طور پر ہندو گھرانوں میں نہیں ہیں۔ نذرالاسلام مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے ان کا گھر اس سے مستثنیٰ نہ تھا۔ انہوں نے ان مروجہ الفاظ کو بنگلہ ادب میں اس خوبی سے کھپایا ہے جس طرح انگوٹھی میں نگینہ جڑا ہوا ہوتا ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ دو ایک جگہ پر ایسے الفاظ سے ان کے کلام میں کرختگی اور بدنمائی پیدا ہو گئی ہے۔ مگر عام طور پر اس سے کلام کی سامعہ نوازی اور شگفتگی میں اضافہ ہی ہوا ہے۔

عربی و فارسی الفاظ اور اسلامی تہذیب و تمدن کی ترجمانی:۔

اتنی بات لسانیات کے ہر طالب علم کو معلوم ہے کہ الفاظ غیر جاندار ہونے کے باوجود جاندار ہوتے ہیں۔ وہ اسلاف کے جذبات و خیالات اور ان کی امیدوں اور حسرتوں کو معدومیت کی دست برد سے ابدالآباد تک محفوظ رکھتے ہیں۔ ایک زمانے کے ذہنی خزانوں

کو آئندہ نسلوں تک پہنچاتے ہیں۔ عہد بہ عہد خصوصیات، تاریخی واقعات، مذہبی رسوم و اعتقادات اور تہذیب و تمدن کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ نذرالاسلام کے خاص خاص عربی فارسی کے الفاظ اسلام کی ثقافتی تاریخ کا کام انجام دیتے ہیں اور آگے چل کر بھی یہ کام دیتے رہیں گے۔ ان کی شاعری میں محرم، قربانی، عید، فاتحہ، دوازدہم جیسے الفاظ مسلمانوں کے مذہبی رسوم کے علاوہ خاص خاص تاریخی واقعات پر بھی دلالت کرتے ہیں۔ رسول کریمؐ کے اصحاب عمر فاروقؓ، شیر خدا علیؓ، سیف اللہ خالد (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) ترکستان کے کمال پاشا و انور پاشا، مصر کے زاغلول پاشا، مراکش کے ریف سردار اور افغانستان کے امان اللہ وغیرہ کا ذکر ان کے کلام میں بار بار ملتا ہے۔ ان ناموں کے ساتھ ساتھ ان کی بلند و بالا شخصیتوں کا تصور اور ان کی شجاعت و حمیت کی تصویریں بھی ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ غرض مختلف عربی، فارسی اور اردو الفاظ کے توسط سے نذرالاسلام کی شاعری میں اسلامی تہذیب و تمدن کی وہ ترجمانی ملتی ہے جس سے مدتوں ہمارا ادب بڑی حد تک محروم تھا۔ ذیل کی سطروں میں عربی و فارسی کے الفاظ ــــ امت، گنہگار، حبیب، خدا، پل صراط، نبی، کس طرح اسلامی تہذیب و تمدن کی ترجمانی کرتے ہیں ملاحظہ ہو

امت آمی گنہگار

تبو بھئی نہیں رے آمار

الحمد آمار نبی

, جنی خود حبیب خدارا

جانہارا امت ہتے چائے سکل نبی

تاہنہاری دامن دھری

پل صراط ہودیار، ہوو پار

نذرالاسلام نے صرف ماحول پیدا کرنے کیلئے عربی و فارسی الفاظ کا استعمال نہیں کیا بلکہ کہیں شدتِ جذبات و احساسات کی عکاسی اور کہیں تاثیر کلام کے لئے بھی

ان کا استعمال کیا ہے ۔ ان کی نظم "کمال پاشا" کی چند سطریں پیش کی جاتی ہیں ۔ یہاں شاعر نے عربی و فارسی کے الفاظ ـــ دلاور، تلوار، نیست و نابود، جانور، افسوس، بخت، صاف، جوش وغیرہ سے اپنے جذبے کا کس خوبی سے اظہار کیا ہے ۔ ملاحظہ ہو ۔ ۔

انور ! انور !

دلاور تومی ، زور تلوار ہا تو ۔ آر
نیست و نابود کرد ، مارو حبتو جانور
انور ! افسوس !
بختری صاف دوش
رکیتر اونائی بھائی آر شے تاپ جوش
بھینگے گیچھے شمشیر ـــ پڑے آچھے کھاپ کوش
انور ! افسوس !

قافیوں کی رعایت اور کلام میں جھنکار کی کیفیت پیدا کرنے کے لئے بھی نذرالاسلام نے کبھی کبھی عربی و فارسی الفاظ کا استعمال کیا ہے ۔ ذیل میں ان کے کورس گیت "چل چل چل" کی چند سطریں ملاحظہ ہوں ۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ یہاں انھوں نے شہیدی عید، نید محل (نیند محل)، خیالی بادشاہی اور مسافر سے کلام میں کس قدر تلاطم اور ترنم کی کیفیت پیدا کی ہے ۔ فرماتے ہیں :۔

اور دے آدیش ہانیچے باز
شہیدی عید برسینارا ساج
دِکے دِکے چلے کوچ کواج
کھول رے نید محل
کبے شے خیالی بادشاہی
شئی شے اُتی ئے آجو چاہی

حاس مسافر گان گاہی

فلیس اُمردجبل

نذرالاسلام نے مفردات کے علاوہ عربی، فارسی اور اردو ترکیبات مثلاً "سید مکی مدنی"، "آب حیات" "کلمۂ شہادت"، "شیر یا شہد" وغیرہ کے ذریعے بھی بنگلہ زبان و ادب کو نئے نئے معانی و مضامین سے روشناس کرایا۔ ان کو زبان اور شاعرانہ آرٹ پر بڑی قدرت تھی۔ وہ مذہبی اصطلاحات اور عربی، فارسی اور اُردو کے فقروں مثلاً "انا للہِ ــــ راجعون"، "اللہ اکبر، لا الہ الا اللہ، لا شریک لہ"، "انا الحق" کو اس فنکارانہ کمال اور بلاغت کے ساتھ بیان کر گئے کہ کلام میں کرختگی کا احساس تو درکنار، بلکہ اس سے پڑھنے والوں میں ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ دو ایک نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔

اوئی رویئے دیکھے رے پاگل ہو لو
منصور حلاج
انا الحق، انا الحق بولے
تیجلو جیون

کانڈاری لے تریر پا کا ماجھی ملاح
داڑی مکھے ساری گان لا شریک لہٗ۔

کمال، تو نے کمال کیا بھائی
ہو ہو ہو! کمال تو نے کمال کیا بھائی
خوب کیا بھائی خوب کیا
بزدل وہ دشمن سب بالکل صاف ہو گیا۔

خوب کیا بھائی خوب کیا۔

غرض نذرالاسلام نے کبھی زورِ بیان اور تاثیرِ کلام کے لئے، کبھی اسلامی تہذیب و تمدن کی ترجمانی کی خاطر اور کبھی شاعرانہ آرٹ کے تقاضوں پر عربی، فارسی اور اردو الفاظ کا استعمال کیا اور بنگلہ زبان و ادب کو ایک گراں قدر لفظی سرمایہ بخشا۔ اُسے نئے نئے تصورات سے آشنا کیا، اسلامی ادب کے ایک بیش بہا ذخیرے سے اس کا درجہ بلند کیا۔ اس کو اسلامی سانچوں میں ڈھال کر آنے والی نسلوں کے لئے پاکستانی بنگلہ وجود میں لانے اور اس کے فروغ دینے کا راستہ ہموار کیا۔

نذرالاسلام نے کچھ اردو گیت اور اردو نظمیں بھی لکھیں۔ اردو حمد کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:۔

اے ستّار، اے غفار کر دے بیڑا پار
دریا، پہاڑ، جنگل۔ کرتے ہیں روز منگل
زمین و آسمان کے ذرّے ذرّے کا عقیدہ ہے۔
تو ہے پالن ہار۔ تو ہے کھیون ہار تو ہی ہے کرتار۔ اے ستّار
روزی دینا کام ہے تیرا سب سے اعلیٰ نام ہے تیرا
تو رحمٰن ہے۔ ذی شان ہے۔ سلطان ہے۔ اے ستّار۔
دردِ دل تیرے سوا آہ سنائیں کس کو۔
میرا مالک، میرا خالق، میرا معبود ہے تو
اے ستّار۔ اے غفّار

ادب میں نذرالاسلام کا درجہ

پچیس سالہ ادبی زندگی میں نذرالاسلام نے نظم و نثر کی پچاس سے زیادہ کتابیں پیش کی ہیں۔ نثر نگار کی حیثیت سے بنگلہ ادب میں وہ امتیازی حیثیت کے مالک نہ بھی ہوں تو بھی ان کے نثری کارنامے قابلِ ذکر ضرور ہیں۔ انہوں نے افسانہ، مقالہ، ناول، ناٹک ـــ ادب کے چار اہم شعبوں میں کارنامے چھوڑے ہیں۔ مگر کسی بھی شعبے میں اتنے ممتاز نہیں جتنے کہ شاعری میں اس کے باوجود ان کی نثری نگارشات اس معنی میں اہم ہیں کہ انہوں نے اپنی شاعری میں جو باتیں اجمالی طور پر کہی ہیں، نثری تحریرات میں ان کی توضیحات پیش کی ہیں ان کی نثر شاعرانہ ہے۔ اس میں غور و فکر سے جذبات کی کارفرمائی زیادہ ہے۔

ادب اور سنگیت کو بنگال کی ثقافتی زندگی کا اہم ترین شعبہ خیال کیا جاتا ہے۔ ان دونوں پر نذرالاسلام کا غیر معمولی احسان ہے۔ وہ موجودہ صدی کی تیسری اور چوتھی دہائیوں میں ثقافتی زندگی کے ممتاز ترین نمائندے تھے۔ مختلف الوجوہ ذہانت کے لحاظ سے ربندرناتھ کے بعد وہ بیسویں صدی کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ وہ عہد آفریں اور قومی شاعر ہیں۔ بنگلہ زبان و ادب کے میدان میں وہ عوامی انقلاب کے سب سے بڑے ہیرو ہیں۔ پاک و ہند کی سرزمین نے انھیں اپنی گود میں جنم دے کر بنگلہ ادب کو عالمی انقلابی ادب کی صفِ اول میں کھڑا کر دیا۔ ان کا شمار دنیا کی ادبی تاریخ میں درجہ اول کے فطری اور عملی شاعروں میں ہوتا ہے۔ ریکارڈ گیتوں میں تعداد کے لحاظ سے وہ دنیا بھر میں لاثانی ہیں۔ وہ موجودہ صدی کے مقبول ترین بنگلہ شاعر ہیں۔

یہ بات ظاہر ہے کہ ہنگامی جذباتی کے تحت جو کارنامے معرضِ وجود میں آتے ہیں، وہ دیرپا نہیں ہوتے۔ جذبات کی شدت میں بہت سے کام درہم برہم ہو جاتے ہیں۔ عجلت میں صحت مند منصوبے نہیں بنائے جا سکتے۔ نذرالاسلام نے بہت سی نظمیں ہنگامی جذبات کے زیرِ اثر لکھی ہیں۔ شدت

جذبات کی وجہ سے ان کی بعض نظمیں قدرے سطحی اور غیر منظم ہوگئی ہیں اور بعض بہت طویل بھی ہوگئی ہیں۔ بعض مقامات میں ایک ہی خیال کو بار بار دہرایا گیا ہے۔ کہیں کہیں حسین ترین مصرعوں کے پہلو بہ پہلو پست درجے کے مصرعے بھی نظر آتے ہیں۔ تاہم اس سے ان کی شاعرانہ عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ انہوں نے قوم کو جو کچھ دیا ہے وہ بھی کیا کم ہے ؟ انہوں نے نظموں کا ایک ایسا ذخیرہ بھی چھوڑا ہے جو لفظی اور معنوی حیثیتوں سے ادب کے لئے مایۂ ناز ہے۔ انہوں نے قوم پر جو احسان کیا ہے ، وہ کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی شاعری نے قوم کیلئے عیسیٰ نفسی کا کام کیا ہے۔ اس کے مردہ قالب میں خونِ زندگی دوڑایا ہے۔

ہنگامی نظموں کے تمام نقائص کے باوجود بھی یہ نذرالاسلام کا وہ کارنامہ ہے، جس نے انہیں بنگال کا محبوب ترین شاعر بنادیا ہے۔ شروع شروع میں وہ "سپاہی شاعر" کہلاتے تھے، ہنگامی نظموں نے انھیں باغی شاعر کے لقب سے نوازا ہے۔ ان نظموں کو کہاں تک ادبی پائیداری نصیب ہوگی، خود زمانہ اس کا فیصلہ کرے گا مگر اس سے کسی کو انکار نہ ہوگا۔ کہ ان کی شاعری ظلم و ستم کے خلافِ جنگ ہے۔ اسی لئے جہاں جور و استبداد سر اٹھائیگا وہیں زمانے کو نذرالاسلام اور ان کے ادب کی ضرورت محسوس ہوگی۔ اپنے ماحول کا ترجمانی کرنا اور سماج کی غلطیوں کا ازالہ کرنا شاعر کا فرضِ اوّلیں ہے۔ نذرالاسلام نے اس فریضے کو بخوبی انجام دیکر زمانے کی مانگ پوری کی ہے۔ اس لئے سیاسی اور سماجی تاریخ انہیں کبھی فراموش نہیں رسکتی۔ ممکن ہے کہ یہ نظمیں انہیں حیاتِ جاوید بخشنے کے لیے کافی نہ ہوں، تو کیا حرج! وہ نظموں اور گیتوں کے ایک ایسے بھاری ذخیرے کے بھی خالق ہیں، جو انھیں زندہ جاوید بنانے کے لئے کافی ہے۔ یہ وہ کارنامہ ہے جس کی اہمیت سے نہ کوئی شاعر انکار کرسکتا ہے، نہ کوئی بڑے سے بڑا نقاد۔

اقبال کی طرح نذرالاسلام بھی زندگی کے شاعر تھے۔ ان کا ادب ہرگز برائے ادب نہ تھا ان کو ادب سے دماغی عیاشی کرنا بالکل ناپسند تھا۔ انھیں تو اپنے جذبات سے ملک اور ملت کے جذبات کو متاثر کرنا مقصود تھا۔ اسی لئے وہ فلسفیانہ موشگافیوں سے دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ صناعی اور رنگینی

کی طرف ان کی توجہ رہتی ۔ انسانیت کو افلاس جہالت اور ظلم سے نجات دلانا ہی ان کا فلسفۂ زندگی تھا۔ ان کے ادب کا مستقبل کیا ہے، انھیں اس کی پرواہ ہی نہ تھی۔ خود فرماتے ہیں :-

بھائیو ! میں دورِ حاضر کا شاعر ہوں۔ مستقبل کا نبی نہیں ہوں
مجھے شاعر یا غیر شاعر جو بھی کہو ۔۔ بسر و چشم مان لیتا ہوں۔
دوستو ! میں درد کا مارا ہوں۔ بڑے بڑے خیالات اور
بلند پروازیاں میرے دماغ میں نہیں آسکتیں۔
دوستو ! تم لوگ جو عیش و آرام میں ہو، لافانی نظمیں لکھتے رہو۔
وقت کے ان ہنگاموں کا خاتمہ ہو جائے، تو میں زندہ رہوں
یا نہ رہوں ۔
مجھے اس کی پرواہ ہی نہیں ۔
سر یہ رابندر ناتھ ودراں ہے ۔ ملک میں دوسری لائق و فائق
ہستیاں بھی ہیں ۔
(وہی لوگ اپنی لافانی نظموں سے زندہ جاوید ہو کر رہیں گے)

ادب کے متعلق نذرالاسلام کا نظریہ یہ ہے :-

" آرٹ کے معنی اظہارِ حقیقت (Execution of Truth) ہے ۔ ہر حقیقت حسن ہے اور ہر حسن خیر ۔ آرٹ کو تخلیق، جذبۂ مسرت یا انسان اور فطرت (union of man and nature) وغیرہ بہت کچھ کہا جا سکتا ہے مگر اظہارِ حقیقت ہی اس کا اہم ترین مقصد ہے

نذرالاسلام کی شاعری کو اس معیار پر جانچا جائے تو وہ پوری پوری اترتی ہے خلوص اور واقعیت ان کی شاعری کی جان ہے ۔ وہ پیامی شاعر ہیں ۔ ان کا ایک فلسفۂ زندگی ہے اسی لئے ہم ان سے صناعی اور عبارت آرائی کی توقع نہیں کر سکتے ۔ وہ حقیقت پسند شاعر ہیں حقیقت کے اظہار میں انہوں نے کبھی کوتاہی نہیں کی ۔ یہی ان کا فلسفۂ ادب ہے، یہی ان کا فلسفۂ حیات ہے ۔

اقبالؔ کے نظریۂ فن کا خلاصہ بھی یہی ہے۔ فرماتے ہیں ۔

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
ترا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شئے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

(ضربِ کلیم)

ترک شاعر ناظم حکمت نے آرٹ کے متعلق جو نظریہ پیش کیا ہے، اس معیار پر بھی نذرالاسلام کی شاعری پوری اُترتی ہے ۔

'Real art is the art
that reflects life. one can-
find in it all the confli-
cts, struggles, inspiration
victories, defeats and love
of live, all the aspects of
human, personality.
Real art is the art that
does not give fals ideas
of life".

ٹیگور ادب برائے ادب کے قائل ہیں مگر نذرالاسلام ادب برائے ادب کے قائل نہیں بلکہ ادب برائے زندگی کے قائل ہیں ۔ انہوں نے ادب سے شیشہ سازی کے بجائے آلاتِ سنگ زنی کا کام لیا ہے ۔ ان کے نزدیک وہ آرٹ، آرٹ ہی نہیں جو ضربِ کلیمی نہ رکھتا

ہو۔ ان کا ادب پڑھتے وقت لوگ اپنے کو کھو نہیں دیتے بلکہ وہ زندگی کے قائل ہو جاتے
ہیں۔ ان کو یہ بات بخوبی معلوم تھی کہ نرم آوازوں سے ظالم طبقے کا دل ہلایا نہیں جا
سکتا۔ ادب برائے ادب کے پجاریوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ان کی
سریلی آوازوں سے غریبوں اور مظلوموں کے دل مسحور نہ ہوں گے۔ فلاکت زدہ لوگوں کو
وہ ادب چاہئے جو ان کے معاشی مسائل کے حل اور بنیادی حقوق کے حصول میں معاون ثابت
ہو۔ زمانے کی مانگ یہ ہے کہ آرٹ برائے حیات ہو۔ جو آرٹ برائے آرٹ ہو، اس کا محل
خاک میں مل جائے گا فرماتے ہیں۔

> تمہارے فن کارانہ بانسری کے سُروں سے یہ لوگ (غریب) مسحور نہ ہوں گے
> ضرورت کے تقاضوں پر تمہارے آرٹ کا یہ محل خاک میں ملا دیا جائے گا۔

نذرالاسلام کا ادب عوامی ادب ہے۔ وہ ادب سے عوام میں انقلاب لانا چاہتے
ہیں یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ادب میں صناعی اور رنگ کاری نہیں کی۔ بلکہ سیدھے سادے
اور پُرجوش الفاظ سے عوام میں بیداری کی روح پھونکنے کی کوشش کی ان کی آواز کے
ساتھ ان کا خونِ جگر شامل تھا اسی لئے عوام پر ان کے کلام کا سحر کارانہ اثر ہوا ہے
نذرالاسلام نے عوامی ادب کی تعریف ان الفاظ میں کی۔

> ملک کے بےشمار عوام کے دلوں میں جو ادب انقلاب لا سکتا
> ہے، وہی عوامی ادب ہے۔ اس کی زبان سیدھی سادی ہوگی
> تاکہ سب لوگ اسے سمجھ سکیں:

(جوگ سرستا نذرل)

نذرالاسلام کو کورانہ تقلید بالکل پسند نہ تھی۔ وہ علم و ہنر سے کرداروں کی تشکیل کرنا
چاہتے تھے۔ ان کے آرٹ اور ہنر کا مقصد یہی تھا کہ اس سے لوگوں میں احساسِ نفس بیدار ہو
قومی اور حب الوطنی کا جذبہ پیدا ہوا۔ قومی احساس کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی اور عالمگیر
احساس بھی ابھر آئے۔ انہوں نے کہا۔

"غیر کے تمام خیر و شر کے اصولوں کو اندھا دھند مان لینا اپنی
روحانی قوت اور قومی صداقت کی انتہائی تحقیر ہے۔ اپنی قوت
اور اپنی قومی خصوصیت کا کھو دینا انسانیت کی بڑی توہین ہے۔
پوری دنیا سے اپنے ملک کا ناطہ جوڑ لینا چاہئے۔ اپنے ملک کی
حدود میں رہ کر آفاقیت کا ترانہ گانا چاہئے۔ قومی خصوصیتوں
کی بنیاد پر ہمارے ملک کے آنے والے نسلوں کے کردار تعمیر کئے جائیں۔
(نئی تعلیم جوگ بانی)

نذرالاسلام ایک ایسے طرزِ تعلیم کے خواہاں تھے، جس سے انسانی صلاحیتیں بروئے کار
آسکیں ہر فرد و بشر میں خودی بیدار ہو سکے۔ ہمارے ملک کے نونہالوں میں زندگی اور حرکت و
عمل کا جذبہ پرورش پاسکے۔ بیک وقت ان کی جسمانی اور روحانی قوتیں پنپ سکیں۔
انہوں نے کہا۔

ہماری خواہش ہے کہ ہمارا طرزِ تعلیم ایسا ہو، جس سے ہماری زندگی کی
صلاحیتیں رفتہ رفتہ ابھر آئیں اور توانا ہو جائیں۔ جس طرزِ تعلیم
سے بچوں کی جسمانی اور ذہنی قوتیں یکساں صحت مند ہو سکیں۔
وہی ہمارا طرزِ تعلیم ہوگا۔"
(قومی یونیورسٹی، جوگ بانی)

مختصر لفظوں میں نذرالاسلام کا ادب اتنا ہی وسیع ہے جتنی کہ ہماری زندگی۔
انہوں نے اپنی نگارشات اور شاعری سے قوم کی زندگی سدھارنے کی کوشش کی ہے۔
حقیقت کا اظہار ان کا نصب العین تھا۔ زندگی بھر انہوں نے اس پر شد و مد کے ساتھ
عمل بھی کیا ہے۔ اسی لئے ہم انہیں بنگال کا 'ترجمان الحقیقت' اور 'لسان العصر' کہہ سکتے ہیں۔
انہوں نے مستقبل کی پروا نہ کی۔ مگر مستقبل نے ان کی پروا کی۔ بنگلہ ادب میں ان کا
نام اکرام و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے اور لیا جائے گا۔ انہوں نے بنگلہ ادب کو لفظی اور

معنوی حیثیت سے نئے رنگ و آہنگ سے آشنا کیا۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد جنہوں نے ٹیگور ہی عہد ہی میں ٹیگور کے طرزِ ادب سے الگ ہٹ کر "جدید ادب" کو جدید تر بنانے کی کوشش کی ان میں نذرالاسلام کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

جدید شعراء پر نذرالاسلام کا اثر:-

بنگال کے جدید شعراء پر نذرالاسلام کا زبردست اثر ہے۔ پریمیندر مترا، جیونا سند داس بمل چندر گھوش، سبھاش مکھوپدھیائے، دنیس داس، سُکانتو بھٹاچاریہ، غلام قدوس، سید منظر احمد، محی الدین وغیرہ ان کے باغیانہ و جواں مردانہ خیالات، سماجی غلطیوں کے خلاف ان کے اظہارِ نفرت، ان کی تعلیم مساوات، انسان دوستی اور حب الوطنی کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔ فرخ احمد، تعلیم حسین، میزان الرحمٰن اور مفخر الاسلام ان کی اسلامی تہذیب و تمدن کی ترجمانی اور قدیم شان و شوکت کی ترجمانندگی سے بہت متاثر ہیں۔ نذرالاسلام کی طرح یہ حضرات بھی اسلامی ضابطۂ حیات کو عملی شکل دے کر دنیا میں امن و امان قائم کرنا چاہتے ہیں۔ غلام مصطفیٰ (۱۸۹۷ء سے ۱۹۶۴ء) نذرالاسلام کے ناقد بھی تھے اور معتقد بھی۔ ان کی شاعری پر بھی نذرالاسلام کی گہری چھاپ ہے۔ یہاں یہ بات بھی واضح ہے کہ نذرالاسلام نے جدید بنگلہ شاعری پر لفظی حیثیت کی بہ نسبت معنوی حیثیت سے زیادہ اثر ڈالا ہے۔ یہ ایک بڑی حیرت انگیز بات ہے کہ نذرالاسلام زندگی بھر جس شاعر کی استادی کا اعتراف کرتے رہے وہی آخر اپنے شاگرد سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ ہے سلطان الشعراء ربندر ناتھ ٹیگور۔ ان کی شاعری کا عام رجحان عرش بریں کی طرف رہا مگر نذرالاسلام کی عوامی شاعری کی مقبولیت کو دیکھ کر انہوں نے بالآخر اپنی شاعری کو خاک نشینوں کے جذبات کا آئینہ بنا دیا۔ انہوں نے غالباً نذرالاسلام ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں اس شاعر کا پیغام سننے کے لئے ہمہ تن متوجہ ہوں۔

جو مٹی سے قریب ہے :

عوامی شاعر نذرالاسلام :-

گو ستیندر ناتھ، جیتندر ناتھ وغیرہ کی شاعری میں مفلوک الحال لوگوں کے جذبات و احساسات کی ترجمانی ملتی ہے مگر ان کے یہاں وہ گہرائی خلوص اور واقعیت نہیں ملتی ہے۔ ان کی شاعری عوامی جذبات کی بہترین ترجمان ہے شاید ہی بنگلہ ادب کی تاریخ میں آج تک کسی کی شاعری میں عوام کے دُکھ سکھ کی ایسی کامیاب ترجمانی ملے۔ ان کی شاعری میں یکساں طور پر ہندو اور مسلمانوں کے جذبات کی نمائندگی ملتی ہے۔ سرزمین بنگال میں کسی شاعر کو ایسی ہردلعزیزی نصیب نہیں ہوئی جتنی کہ نذرالاسلام کو ہوئی ہے۔ دوسری طرف کسی کی شاعری بھی عوام کے دل پر ایسے زبردست نقوش نہیں چھوڑ سکی جیسے کہ ان کی شاعری نے چھوڑے ہیں۔ ان کی شاعری کے دو مقصد تھے ــــ سیاسی آزادی اور اقتصادی آزادی پہلا مقصد حاصل ہوا۔ ملک آزاد ہوا۔ عوام بھی آزاد ہوئے مگر اقتصادی حیثیت سے اب بھی عوام آزاد نہ ہو سکے۔ جس امن و امان اور حسن کے وہ جویا تھے وہ اب تک وجود میں نہ آیا۔ اس لئے اب بھی ہمیں ان کے ادب کی سخت ضرورت ہے اور جب تک دنیا میں ظلم و ستم برقرار رہے گا، طبقاتی اونچ نیچ باقی رہے گا اور عوام کو معاشی آزادی حاصل نہ ہوگی۔ قوم اور ملت کو ان کے ادب کی ضرورت محسوس ہوتی رہے گی۔

نذرالاسلام کا اثر مشرقی پاکستان پر

عشق کو فریاد لازم تھی، سو وہ بھی ہو چکی
اب ذرا دل تھام کر فریاد کی تاثیر دیکھ

(اقبال)

نذرالاسلام مشرقی پاکستان کے مقبول ترین شاعر ہیں۔ ملک کے اس حصے کا بچہ بچہ ان کے نام گرامی سے واقف ہے۔ پیر و جوان، خواص و عام سب ہی انہیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ گو ان کی پیدائش مشرقی پاکستان میں نہیں ہوئی۔ پھر بھی یہاں کے لوگوں کے دل میں ان کی اور ان کے ادب کی بڑی عظمت ہے۔ انہوں نے یہاں اپنی زندگی کے کافی دن گذارے مختلف مقامات کی سیر کی۔ ان کے ادب پر مشرقی پاکستان کے فطری مناظر کا نمایاں اثر نظر آتا ہے۔ انہوں نے اپنی ابتدائی زندگی میں کچھ دنوں تک میمن سنگھ کے دریرام پور ہائی اسکول میں تعلیم بھی حاصل کی تھی بہت دنوں تک کوملا اور ڈھاکے میں رہے۔ ان کی پہلی شادی کوملا میں ہوئی اور دوسری شادی بھی یہاں کے ایک خاتون سے ہوئی۔ وہ ایک دفعہ ڈھاکہ ڈویژن سے مرکزی قانون ساز اسمبلی کی سیٹ کے بھی امیدوار رہے۔ مشرقی پاکستان کے لوگوں کے دل، و دماغ اور یہاں کے ادب و ثقافت پر ان کا زبردست اثر نظر آتا ہے۔

نذرالاسلام کی پیدائش ملک اور عوام کے لئے باعث رحمت تھی۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد مسلمانوں پر ادبار کی گھٹائیں چھانے لگیں۔ مغلیہ حکمرانوں کی رہی سہی شان و شوکت بھی ختم ہونے لگی پستی و ابتری نے ان کا منہ دیکھ لیا تھا۔ چاروں طرف مسلمان ٹھوکریں کھانے لگے۔ طوفانِ مغرب میں ان کی عزت و حرمت اور تہذیب و تمدن کی متاعِ عزیز بہتی چلی جا رہی تھی۔ متاعِ جاں کے ساتھ احساسِ زیاں بھی جاتا رہا تھا۔ عوام کا

کوشش علم اور گرمئ عمل سرد پڑ چکی تھی۔ ثقافتی، اقتصادی اور سیاسی زندگی ڈھال
نظر آ رہی تھی۔ دلوں میں ہراس اور آنکھوں میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ہر شخص کا مستقبل تاریک
سا ایک نظر آ رہا تھا۔ برائے نام جو رہنمایانِ قوم رہ گئے تھے، وہ اپنی بنیادی کمزوریوں اور
بے پناہ سیاسی خطروں سے کانپ رہے تھے۔

اس تاریک وقت میں سرسید (۱۸۱۷ء — ۱۸۹۸ء) کی علی گڑھ تحریک نے
اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ تعلیم و تربیت کی طرف مسلمانوں کی توجہ مبذول کی۔ مسلمانانِ ہند
کو قعرِ مذلت سے نکال کر ان میں نئی روشنی کی روح پھونکنے کی کوشش کی۔ سرسید
کے رفقائے کار نے اس تحریک کی بڑی حمایت کی۔ اپنے مضامین اور شاعری سے عوام کی ذہنیت
کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ حصولِ آزادی کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائی۔ حالی
(۱۸۳۷ء — ۱۹۱۴ء) نے اپنی قومی نظموں سے سیدھے سادے اور دردناک انداز
میں مسلمانوں کو ان کی سنگین غفلت اور خوفناک حالات سے آگاہ کیا۔ اکبر الہ آبادی
(۱۸۴۶ء — ۱۹۲۱ء) نے طنز و مزاح کے حربوں سے مغربی تہذیب و تمدن کے سیلاب
کو روکنے کی کوشش کی۔ نیز اسلامی تہذیب و تمدن کی کورانہ تقلید کا خوب خوب مذاق
اڑایا۔ مشرقی اور اسلامی تہذیب و تمدن کو فروغ دینے کیلئے خون اور پسینہ ایک کر دیا۔
آخر حکیم الامت شاعرِ مشرق، ترجمانِ حقیقت علامہ اقبال (۱۸۷۶ء — ۱۹۳۸ء)
قوم میں بانگِ درا، اور ضربِ کلیم لئے ہوئے خضرِ راہ بن کر آئے۔ انہوں نے بانگِ درا
سے قوم کو خوابِ غفلت سے جگایا۔ ضربِ کلیم سے لوگوں کو میدانِ عمل میں لا کھڑا کیا۔
پاکستان کا خواب بھی دیکھا اور اس کی تشکیل و تعمیر کا راستہ بھی ہموار کیا۔

بلاشبہ علی گڑھ تحریک اور حالی و اقبال کے پیغامات نے قومی بیداری میں
اہم رول انجام دیا تھا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ بنگال کے مسلمانوں پر ان تحریکات کا خاطر خواہ
اثر نہیں ہوا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ سرزمینِ بنگال علی گڑھ سے کافی دور واقع ہوئی ہے مزید
برآں ان تحریکوں کے زمانے میں مواصلات کا بھی کوئی اچھا انتظام نہ تھا جیسا کہ آج کل ہے

سرسید نے تہذیب الاخلاق نکال کر قوم کو سدھارنے کی کوشش کی۔ یہ پرچہ اردو میں تھا حالی۔ اکبر اور اقبال اردو بولنے والے تھے۔ انہوں نے اردو میں شاعری کی اور اردو ہی میں قوم کو بیداری کا پیغام سنایا۔ بنگالی مسلمان اردو سے بہت کم واقف تھے۔ اس وجہ سے ملک کے اس حصے میں سیاسی اور ادبی تحریکوں سے حسب توقع قومی بیداری اور سیاسی آزادی کا احساس پیدا ہونا مشکل ہے۔ بے شک ۱۹۰۶ء میں نواب سر سلیم اللہ کے زیر سرکردگی ڈھاکے میں مسلم لیگ کی داغ بیل پڑی۔ مگر عوام اس قدر بے حسی میں مبتلا تھے کہ یہ تحریک بھی ان کے مردہ قالب میں خونِ زندگی دوڑانے کے لئے کافی رہتی۔ یہ تحریک بھی تعلیمیافتہ حلقوں میں محدود ہو کر رہ گئی۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب تک ادبی تحریک سے لوگوں کی ذہنی نشو نما نہ ہو، سیاسی تحریک کارگر نہیں ہو سکتی۔ سرزمین بنگال میں کوئی ایسا پرجوش اسلامی ادب نہ تھا جو مسلمانوں کی رگ حمیت میں خونِ زندگی دوڑا سکتا۔

ترکی حکومت کو مسلم دنیا کی قوتوں کا سرچشمہ خیال کیا جاتا تھا۔ ہر اسلامی ملک اور ہر مسلمان کو پین اسلامزم (Pan Islamism) اور عالمی برادری کی بنا پر اس ملک سے دلی ہمدردی تھی پہلی جنگ عظیم کے بعد جب یہ ملک خطرے میں نظر آیا۔ برطانوی حکومت اور اتحادی قوتوں نے جنگ کے دوران کئے ہوئے وعدے فراموش کر کے اسے آپس میں بانٹ لینے کا تہیہ کر لیا، تو پاک و ہند کے مسلمانوں کے مذہبی جذبے کو ٹھیس لگی۔ وہ ترکی کی حمایت پر تل گئے۔ مولانا محمد علی اور شوکت علی کے زیر قیادت ملک بھر میں تحریکِ خلافت (۱۹۱۹ء) کی آگ بھڑک اٹھی۔ ساتھ ہی ساتھ مہاتما گاندھی کی تحریکِ ترکِ موالات نے بھی مسلمانوں کی حمایت پاکر زور پکڑا۔

غرض پاک و ہند میں حکومت برطانیہ کے خلاف ایک زبردست انقلاب برپا تھا اس انقلاب کا اثر بنگال پر بھی پڑا۔ عالمگیر اسلامی برادری کی بنیاد پر ترکوں کی اس نازکیِ حال سے اس علاقے کے مسلمان متاثر ہوئے بغیر کیسے رہ سکتے تھے؟ مگر بدقسمتی سے اس دفعہ بھی انقلاب کا اثر سیاسی اور تعلیمی حلقوں سے گذر کر عوام تک پہنچنے کی کوئی صورت

نظر نہیں آرہی تھی۔ اس لئے کہ ملک کے جو عوام مدتوں سے غفلت کی گہری نیند سو رہے تھے ان کی روح کو گرمانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس لئے کہ ایک ہمہ گیر ذہنی انقلاب کی ضرورت تھی۔ جب تک ذہنی انقلاب نہ ہو، سیاسی انقلاب کارگر نہیں ہو سکتا۔ کچھ وقتی اثر اگر کہیں رونما بھی ہو تو وہ دیرپا نہیں ہو سکتا۔ قوم کی اس نازک حالت میں ٹیگور کی شاعری کا آفتاب نصف النہار پر تو تھا مگر ان کے نرم و نازک نغمے عوام کو کب بیدار کر سکتے تھے؟ اس کام کے لئے سرزمین بنگال میں ایک ایسی فولادی شخصیت کی ضرورت تھی جس کے پاس عزرائیل[۱] کے سے کا زور ہو، اسرافیل[۲] کا صور ہو اور میکائیل[۳] کی کڑک ہو جو انقلاب کا پیغام گھر گھر پہنچا سکے۔ غلامی، ناانصافی، جفاکاری اور باہمی جنگ و جدل کے خلاف اعلانِ جنگ کر سکے۔ اور ایک جہانِ نو کی تخلیق و تعمیر کی بشارت دے سکے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مدت دراز کے انتظار کے بعد اس نازک حالت میں بنگال کی خوابیدہ بستی میں مجاہدِ اعظم نذرالاسلام رونما ہوئے۔ انہوں نے دیکھا کہ انسان نوعِ انسان کا شکاری ہے۔ انسانی قدریں پامال کی جا رہی ہیں۔ حکومتِ برطانیہ عوام پر مظالم ڈھا رہی ہے۔ حکومت کے خلاف ملک میں احتجاج کیا جا رہا ہے۔ تحریکِ آزادی کا آغاز ہو رہا ہے۔ ان حالات تحریک آزادی کو عوام تک پہنچانے اور اسے بارآور بنانے کے لئے انہوں نے ادب کو حربہ بنایا اور انقلابی نعروں سے لوگوں میں سیاسی، سماجی اور اقتصادی شعور پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اور عوامی بیداری سے ملک کی آزادی حاصل کرنا چاہی۔

یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ بنگال کے مسلمان کسی شاعر کے اس قدر ممنونِ احسان نہیں جتنے کہ وہ نذرالاسلام کے ہیں۔ انہوں نے بنگال کے چار پانچ کروڑ مسلمانوں کو سوزِ حیات بخشا۔ یوں تو ان کی شاعری کا اثر پورے پاک و ہند پر ہوا۔ مگر بنگال کے مسلمانوں پر اس کا اثر نمایاں طور پر ہوا۔ انہوں نے قوم میں انقلاب کا جو بیج بویا تھا، وہ ایک تناور

درخت بن کر تحریکِ پاکستان کی شکل میں نمودار ہوا ۔ ہمیں جو پاکستان ملا ہے، وہ بڑی حد تک ان کی انقلابی تحریک کا ثمرہ ہے ۔ انہوں نے تحریکِ علی گڑھ، تحریکِ خلافت اور حالی و اقبال کے پیغامات کو یہاں بار آور بنایا۔ ان کی سعی مشکور ہوئی ۔ ان کے طفیل قوم سرمند ہوئی ہے۔ ان کے بارِ احسان سے قوم کبھی سر اٹھا نہیں سکتی ۔

قیامِ پاکستان کے بعد نذرالاسلام اور اقبال کی اہمیت پہلے سے اور بھی بڑھ گئی ہے ۔ آزاد قوم ہی قومی ہیرو کا صحیح احترام کر سکتی ہے ۔ یہ دونوں ادبی انقلاب کے قومی ہیرو ہیں ۔ یوں تو یہ دونوں پورے پاکستان میں عزیز ہیں، مگر نذرالاسلام مشرقی پاکستان کے اتنے ہی پیارے ہیں جتنے کہ مغربی پاکستان میں اقبال ۔ مشرقی پاکستان پر نذرالاسلام کا اثر اس قدر غالب ہے جس قدر کہ اقبال کا اثر مغربی پاکستان پر ۔ مشرقی پاکستان میں ہر سال ۱۱ جیٹھ کو نذرالاسلام کا یوم ولادت بڑی شان و شوکت سے منایا جاتا ہے ۔ یہاں کی ثقافتی زندگی پر ان کا نمایاں اثر نظر آتا ہے ۔ ان کے اسلامی سنگیتوں کے بغیر مذہبی محفلوں میں گرمی پیدا نہیں ہوتی ۔ سینکڑوں ہزاروں لوگ ان کی نعتیں اور غزلیں التزام کے ساتھ پڑھتے ہیں اور سر دھنتے ہیں ۔ میلاد شریف میں ان کے نبیگلہ قصائد پڑھے جاتے ہیں ۔ ان کا مترجم پارۂ عم شوق سے پڑھا جاتا ہے ۔ رسول کریمؐ کی سیرت پر لکھی ہوئی ان کی کتاب مروبھاسکر اسلامی ادب کا مایۂ ناز ہے ۔ مختصر لفظوں میں نذرالاسلام مذہبی حلقے میں بھی لوگوں کے پیارے بنے ہوئے ہیں ۔

مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ مذہبی لوگوں کا ایک طبقہ پہلے بھی نذرالاسلام سے ناراض تھا اور اب بھی ہے ۔ ان کا ایک ہندو لڑکی سے شادی کرنا، ہندو خاندانوں میں ان کا بے تکلفانہ رہنا سہنا، اپنے بیٹوں کا غیر اسلامی نام رکھنا ـــ یہ ایسی باتیں ہیں جس کی وجہ سے مذہبی لوگوں کے جذبے کو ٹھیس لگنا فطری بات ہے ۔ کون ہے جو نذرل کے اسلامی جوش و جذبے سے متاثر نہیں ہوتا ۔ اگر ان میں یہ مذہبی کوتاہیاں نہ ہوتیں تو وہ آج سبھوں کے یکساں طور پر منظورِ نظر بنے رہتے ۔ رہی یہ بات کہ نذرالاسلام نے خدا سے بغاوت کی ہے، یہ ادب میں کوئی نئی

چیز نہیں عمر خیام، حافظ، غالب، اقبال وغیرہ سے بھی باغیانہ انداز میں خدا سے بات چیت کی۔ اور وہ طرز سخن بظاہر اس سے کہیں زیادہ گستاخانہ ہے۔ یہ دراصل ان کی بغاوت یا گستاخی نہیں بلکہ شوخی ہے۔ بہرحال مشرقی پاکستان کے دل و دماغ پر نذرالاسلام چھائے ہوئے ہیں۔ ثقافتی محفلوں میں نذرل گیتی نہ سنائی جائے، تو وہ ادھوری خیال کی جاتی ہیں۔ ریڈیو پاکستان، ڈھاکے کے روزانہ پروگراموں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس میں ان کے دو چار گیت اور غزلیں شامل نہ ہوں۔ دن رات ریستورانوں اور ہوٹلوں میں ان کے نغموں کے ریکارڈ بجائے جاتے ہیں۔ قومی اجتماعوں میں قومی جذبات کو ابھارنے کے لیے زیادہ تر انہیں کی نظمیں گائی جاتی ہیں۔ مشرقی پاکستان کے گوشے گوشے میں لوگ نذرل سوسائٹی، نذرل ساہتیہ پریشد، نذرل لائبریری، نذرل بک ڈپو غرض ان کے نام پر مختلف اداروں کے قیام سے انہیں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ محلوں سے لیکر جھونپڑیوں اور میدانوں تک ہر جگہ ان کے نغمے سنائی دیتے ہیں۔ اسکول، مدرسے اور کالج کے ایسا لوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس میں نذرالاسلام کا کلام کم و بیش شامل نہ ہو۔

مشرقی پاکستان کے متعدد شعراء پر نذرالاسلام کی شاعری کا گہرا اثر نظر آتا ہے بے نظیر احمد، محی الدین، فرخ احمد، تعلیم حسین، غلام مصطفیٰ اور میزان الرحمٰن کے نام اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں۔ محی الدین اور بے نظیر احمد نے نذرالاسلام کے انقلابی رنگ و آہنگ، ان کے معاشرتی احساس، ان کے فلسفۂ حیات اور انسان دوستی سے اثر قبول کیا ہے۔ بے نظیر کی کتاب بیساکھی میں مرتو کوتھالو (موت کہاں ہے بولو) کے عنوان سے ایک نظم ہے۔ اس کا طرز و انداز ہمیں نذرالاسلام کی نظم "بدروہی" کی یاد دلاتا ہے۔ اس نظم میں بے نظیر صاحب نے انانیت کا وہ تصور پیش کیا ہے، جو نذرالاسلام نے بدروہی میں پیش کیا تھا۔ بے نظیر صاحب کا خیال ہے کہ سرمایہ داروں کی خود غرضی اور انتہائی ہوا و ہوس ہی عوام کے دکھ درد کا ذمہ دار ہے۔ کسانوں کی محنت سے سرمایہ داروں کا گنجینہ بھرپور ہوتا ہے مگر وہ خود تنگدست رہ جاتے ہیں۔ اس حقیقت

انھوں نے اِن الفاظ میں ادا کیا ہے (سرمایہ داروں سے خطاب ہے) .

میں خوب خوب جانتا ہوں کہ تیرے گھر کی اینٹوں کی لالی
زینت کی بہار نکھار رہی ہے -
میرے سینے کے تازہ خون ہی سے
ہمیشہ اُس کا رنگ رُوپ تیار ہوتا ہے
تیرے وہاں تو چاندنی رات ہے -
مگر میرے یہاں تو روشنی کا وجود ہی نہیں -

فرخ احمد اور تسلیم حسین بھی نذرالاسلام کے اسلامی جذبات و خیالات سے متاثر ہیں - یہ دونوں بھی نذرالاسلام کی طرح مسلمانوں کی قدیم شان و شوکت واپس لانے کی آرزو رکھتے ہیں - اسلامی تصورات و تفکرات کی روشنی میں ایک پُرامن معاشرے کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں اسلامی موضوعات پر یہ دونوں نذرالاسلام کے کامیاب ترجمان ھیں - اسلامی تہذیب و تمدن اور اسلامی شریعت کے علامتی نشان ہلال سے فرخ احمد اس طرح خطاب کرتے ہیں .-

تو پھر صحارا ریگستان کی بادِ سموم لے آ -
تاریکی کی چوٹی توڑ دے ، حسود کی نیند مٹا دے .
تو انسانیت کا تند طوفان ساتھ لے آ -
تباہی کے سینے پر زندگی کی مہر ثبت کر دے -
اور اس دھان کے ملک میں مدینے کی خوشبو مہکا دے -
اے دلیر! تو میا کھی طوفان میں جاگ اٹھ -
اے میرے جراًت مند ہلال! تو جاگ اٹھ -
اے میرے نشان! تو آسمانوں میں دائم قائم رہ جا !

(نشان ، سات ساگر پر مانجھی)

تعلیم حسین فرماتے ہیں :-

تم کہہ دو ـــــ اگر کوئی دین ہے ، تو وہ اللہ ہی کا دین ہے ۔
اس کا واحد نام ہے ـــــ " دین " ـــــ اور بس
پُرامن اور بے خطر اگر کوئی دین ہے تو وہ ـــــ اسلام ہے ۔
اس لیے بلند آواز میں ہم یہی پیغام سناتے ہیں ۔ ۔
کہہ دو ـــــ ہمیں کائنات سے محبت ہے
اگر کچھ پھوٹ ہو ، تو اسے آپس میں مٹاتے ہیں

(کراچی چھک شاہین)

خیالات کے علاوہ طرزِ نگارش میں بھی تعلیم حسین پر نذرالاسلام کا اثر نظر آتا ہے ۔ اس سلسلے میں ان کی نظم " قربانی " ، " مجاہد آمادہ ہے " (روحِ مجاہد کے نام) " ذی النورین " ، " محرم " وغیرہ قابلِ ذکر ہیں ۔ ان نظموں میں انہوں نے نذرالاسلام کی طرح فنکارانہ طور پر عربی ، فارسی اور اردو الفاظ کا وسیع استعمال کیا ہے ۔ کلام میں زور اور روانی پیدا کی ہے ۔

ان شاعروں کے علاوہ اشرف علی خاں ، جسیم الدین ، معز الاسلام وغیرہ پر بھی براہ راست ہو یا بالواسطہ نذرالاسلام کا اثر کم و بیش نظر آتا ہے ۔ معز الاسلام کی چند سطریں پیش کی جاتی ہیں ۔ اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ ان کے خیالات اور اسلوب بیان پر نذرالاسلام کا کہاں تک اثر ہے :-

ـــــ ہم آج اپنی قربانیاں پیش کریں گے ، ہم نئے اسماعیل ہیں ۔
سخت چٹانیں ہمارے قدموں کے تلے ریزہ ریزہ ہو جائیں گے ۔
زم زم کی موجیں اٹھ اٹھ کر ہمارے قدم چومیں گی ۔
زندگی کے دہشت ناک صحرا کو ہم پُرامن بنائیں گے ۔
اس کے راستوں کو رہزنوں سے پاک کرائیں گے ۔

اس ویرانے کی بنجر اور سخت زمین پر ہمارے نقشِ قدم بہار کے
پھول کھلائیں گے۔
محنت کے پسینے ہماری پیشانیوں پر جواہرات کے تاج کی طرح چمکیں گے۔
(صبحِ جہاد — مترجمہ احسن احمد اشک) ۔

غرض موجودہ دور کے بہت سے شعرا نذرالاسلام کے جذبات و خیالات اور ان کے اسالیب بیان سے متاثر ہیں۔ نذرالاسلام کی شاعرانہ روایات کا دھارا اب بھی تیز رفتار ہے اور غالباً آگے چل کر بھی اس کی تیز رفتاری برقرار رہے گی۔ اس لئے کہ وہ نئے شاعر نہیں۔ وہ درجۂ اول کے صاحب طرز انقلابی شاعر ہیں۔ نئے رنگ و آہنگ کے خالق ہیں سب سے بڑھ کر وہ ایک عہد آفریں اور قومی شاعر ہیں۔

افسوس! آج نذرالاسلام علیل ہیں۔ فطرت نے انھیں ہم سے جیتے جی جدا کر دیا ہے مگر وہ جدا ہو کر ہم سے اور زیادہ قریب ہو گئے ہیں۔ انہیں حیاتِ جاوید مل گئی ہے۔ ان کی شخصیت دھندلی ہونے کے بجائے اور روشن، ان کی شاعری مرجھانے کے بجائے اور تر و تازہ ہو گئی ہے۔

نذرالاسلام، اقبال اور ٹیگور
ایک نظر میں

آزادی کا حصول کوئی فوری حادثہ نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ ایک طویل عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ بیج بویا جاتا ہے لیکن درخت کے جڑ پکڑنے، ور پھلنے پھولنے سے پہلے کئی ہاتھوں کے ذریعے اسے پروان چڑھایا جاتا ہے۔ ہمارے حصولِ آزادی کی بھی یہی روداد ہے۔

پاک و ہند کی قومی بیداری اور حصول آزادی میں تنہا کسی ایک ادیب یا شاعر کا حصہ نہیں۔ بلکہ حالی (۱۸۳۷ء — ۱۹۱۴ء)، اکبر (۱۸۴۶ء — ۱۹۲۱ء)، اقبال (۱۸۷۷ء — ۱۹۳۸ء)، رابندر ناتھ ٹیگور (۱۸۶۱ء — ۱۹۴۱ء)، نذرالاسلام (۱۸۹۹ء —) اور دوسرے ادبا و شعرا نے یکے بعد دیگرے برصغیر پاک و ہند کے لوگوں کی ذہنی نشو و نما میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یکایک قومی بیداری کا شعور نہیں ابھرا اور نہ بیک روز پاک و ہند آزاد ہوا۔ بلکہ مختلف ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے ہماری قوم موجودہ درجے پر پہنچی ہے۔

سب سے پہلے حالی نے اپنی قومی نظموں سے ہماری قومی بیداری کا بیڑا اٹھایا۔ اس کے بعد اکبر اور اقبال نے بھی قومی شاعری کے میدان میں قدم رکھا۔ انہوں نے حالی کی بتائی ہوئی راہ میں گامزن ہوکر مسلمانوں میں مذہبی جوش و جذبے کی روح پھونکنے کی کوشش کی۔ اکبر نے انھیں اپنی ثقافت اور روایات کو مغربی تہذیب و تمدن کے حربوں سے بچانے کی تلقین کی۔ اقبال نے خضرِ راہ بن کر پیغمبرانہ شان سے قوم اور ملت کو اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی کی ہدایت دی۔

سرزمینِ بنگال پر حالی، اکبر اور اقبال کی شاعری کا اثر خاطر خواہ نہیں پڑا۔ اس لئے کہ یہ تینوں اُردو کے شاعر تھے۔ انہوں نے اُردو میں قوم کو پیغام دیا۔ تقسیم ملک سے پہلے مشرقی پاکستان میں اُردو کا رواج بہت کم تھا۔ یہاں کے لوگ پورے معنوں میں ان کے کلام سے استفادہ نہ کرسکے۔ البتہ ربندرناتھ ٹیگور اور نذرالاسلام نے ان کے مقاصد کو بہا بارآور بنایا۔

نذرالاسلام اور ربندرناتھ دونوں معاصر ہیں۔ دونوں ایک ہی علاقے اور ایک ہی زبان کے شاعر ہیں۔ نذرالاسلام نے شاعری کے میدان میں اس وقت قدم رکھا۔ جب ربندرناتھ کی شاعری بام عروج پر تھی۔ تمام شعراء و ادبا انھیں کے چشمۂ فیض سے استفادہ کرتے تھے۔ شروع شروع میں نذرالاسلام بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھے۔ مگر وہ ایک غیر معمولی ذہانت و فطانت کے مالک تھے۔ ان کی غیور طبیعت نے زیادہ دنوں تک کسی کی تقلید گوارا نہ کی۔ تھوڑے ہی عرصے میں انہوں نے اپنا راستہ الگ نکالا۔ اور دورِ ربندرناتھ ہی میں اپنی عہد آفرینی کا ثبوت دیا۔ ایک تو فطرت نے ان کی طبیعت میں حدت و ذکاوت ودیعت کر رکھی تھی، مزید براں زمانے کے تقاضوں نے "سونے پر سہاگہ" کا کام کیا۔ مظلوم انسانیت کی پکاروں نے ان کی شاعری میں ایک طوفانی اور ہیجانی کیفیت پیدا کردی۔ یہی جذباتی کیفیت مظلوم انسانیت کے حق میں تو مفید ثابت ہوئی۔ مگر اس کی وجہ سے ان کی ہنگامی نظموں میں گہرائی نہ آنے پائی۔ یہی چیز ان کے اعلیٰ درجے کے خلاق ہونے کی راہ میں رکاوٹ بنی۔ مگر اس کا جذبہ کا یہ بھی ایک فیضان ہے کہ ان کی نگارشات میں جو تندی تیزی ملتی ہے وہ نہ ٹیگور میں ہے اور نہ اقبال میں۔

ربندرناتھ کی شاعری ایک اتھاہ سمندر ہے۔ جس میں گہرائی تو ہے مگر تلاطم نہیں۔ نذرالاسلام کی شاعری ایک جوئبار ہے مگر گہرا تو نہیں مگر پُر ہیجان ضرور ہے۔ جو اچھلتا پھسلتا اور سرکتا ہوا تیزی سے آگے نکل جاتا ہے ربندرناتھ کی شاعری میں ظلم و ستم کے خلاف صرف احتجاج ملتا ہے۔ مگر نذرالاسلام کی شاعری میں وہ جنگ کی شکل اختیا۔

کر لیتا ہے۔

نذرالاسلام، رابندرناتھ اور اقبال تینوں کو انسانیت سے والہانہ محبت تھی۔ تینوں نے انسانیت کے گیت گائے۔ فرق صرف یہ ہے کہ رابندرناتھ اور اقبال نے عوام سے دور رہ کر انہیں محبت کا پیغام سنایا۔ مگر نذرالاسلام نے دلدل میں پھنسے ہوئے انسانوں کے قریب پہنچ کر انہیں نکالنے کی کوشش کی۔ ٹیگور کی شاعری کا جو منتہا تھا، اقبال اور نذرالاسلام کا بھی وہی تھا۔ ٹیگور نے جو باتیں نیازمندانہ انداز میں سنائیں، وہی اقبال اور نذرالاسلام کے یہاں جیتی جاگتی اور انقلابی شکلوں میں پیش کی گئیں۔ اقبال اور ٹیگور عوام سے اتنے قریب نہیں جتنے کہ نذرالاسلام ہیں۔ انہوں نے عوام کو اتنے پاس سے نہیں دیکھا جتنے کہ نذرالاسلام نے دیکھا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ٹیگور کی شاعری میں ایک عالمگیر اور گہری محبت کی تلقین ہے جو سرزمینِ بنگال کے کسی شاعر میں نظر نہیں آتی۔ روحانی تجزیے، زبان کی ملاحت و حلاوت، خیالات کی بلندی، مضامین کے سوز و گداز اور فنکارانہ کمال میں کوئی شاعر ان کا ہمسر نہیں۔ ذہانت اور گوناگوں حیثیتوں کے لحاظ سے پاک و ہند کے اربابِ قلم میں ٹیگور کا نام سرِفہرست نظر آتا ہے۔

نذرالاسلام اور ٹیگور بنگلہ شاعر ہیں۔ مگر اقبال فارسی اور اردو دونوں میں اعلیٰ درجے کے شاعر ہیں۔ یہ تینوں قادرالکلام شاعر ہیں۔ مگر نذرالاسلام اتنے بڑے خلاق نہیں جتنے کہ ٹیگور اور اقبال ہیں۔ ٹیگور اور نذرالاسلام نے نظم و نثر دونوں کے اہم شعبوں میں قابلِ ذکر کارنامے چھوڑے ہیں۔ مگر اقبال کو یہ فوقیت حاصل نہیں۔ اقبال شاعر ہیں فلسفی ہیں اور —— بس۔ نذرالاسلام شاعر، گیت نویس، موسیقی داں، افسانہ نگار، ناول نگار، ناٹک نگار، اداکار، صحافی اور مترجم ہیں۔ ٹیگور بیک وقت شاعر، گیت نویس، موسیقی داں، افسانہ نگار، مقالہ نگار، ناول نگار، ناٹک نگار، نقاش، عکاس اور صحافی ہیں۔

نذرالاسلام، ٹیگور اور اقبال تینوں کو جمالیاتی قدروں کا احساس تھا حسن اور عشق سے تینوں کی دلچسپی تھی۔ غلامی، ناانصافی، افلاس، جہالت اور ظلم وستم کے خلاف تینوں کے یہاں احتجاج ملتا ہے۔ مگر فرق صرف نوعیت اور کیفیت کا ہے۔ اقبال مظلوم انسانیت کی غم خواری میں "کاخ امراء کے درو دیوار ہلا دو" کا پیغام سناتے ہیں۔ "بانگ درا" اور "ضرب کلیم" سے گمراہ قوم کو راہ راست پر لانا چاہتے ہیں نذرالاسلام طبل اور دمامہ بجا کر لوگوں کو جورو استبداد کے خلاف لڑنے کے لئے بر سر پیکار لا کھڑا کرتے ہیں۔ ٹیگور عالمگیر محبت اور برادرانہ ہمدردی کی دعوت دے کر مفاہمت میں مرض کا علاج ڈھونڈتے ہیں۔ منزل تینوں کی ایک ہی ہے تینوں حرکت و عمل کے شاعر ہیں۔ "ترک آب و گل" سے کسی کا واسطہ نہیں۔ کسی کے یہاں فراری کیفیت نہیں۔ بلکہ کام کرنے کے ولولے اور آگے بڑھنے کے جوش و جذبے سے ان کی شاعری سرشار ہے۔ ان میں مغرب کے عمل اور مشرق کی روحانیت کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔

بایں ہمہ اشتراک خیالات، نذرالاسلام، رابندر ناتھ اور اقبال میں تھوڑا بہت فرق بھی ہے۔ نذرالاسلام فلسفی شاعر نہیں، وہ صاف گو اور عوامی شاعر ہیں۔ وہ فلسفیانہ مسائل میں نہیں الجھتے۔ اقبال اور رابندر ناتھ فلسفی شاعر ہیں مگر رابندر ناتھ اتنے فلسفی نہیں جتنے کہ وہ شاعر ہیں برخلاف اس کے اقبال بیک وقت شاعر بھی ہیں اور فلسفی بھی۔ یہ کہا نہیں جا سکتا کہ ان کا کون سا پہلو راجح ہے اور کون سا مرجوح۔ ٹیگور "ادب برائے ادب" کے قائل ہیں مگر اقبال اور نذرل "ادب برائے زندگی" کے حامی ہیں۔

ٹیگور ظلم وستم کی طرف قوم کی توجہ منعطف کر کے اس کی خامیوں کا ازالہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ قوت اور انقلاب کے شاعر نہیں۔ وہ اپنی منزل مقصود کو پہنچنے کے لئے قوت کا استعمال کرنا نہیں چاہتے۔ بلکہ صلح و آشتی اور میل محبت کے حربوں سے میدان جنگ جیتنا چاہتے ہیں۔ نذرالاسلام، اقبال کی طرح نقش کہن کو مٹا کر ایک جہان نو

کی تخلیق کرنے کے آرزومند تو ہیں مگر وہ اسے بروئے کار لانے کا کوئی واضح اور منظم طریقۂ کار پیش نہیں کرسکتے۔ یہ فضیلت حکیم الامت ڈاکٹر محمد اقبال کو حاصل ہے۔ وہ زمین و آسمان مستعار کو مٹاکر اپنی دنیا آپ پیدا کر کا پیغام سناتے ہیں وہ تشخیصِ مرض کے بعد اس کا علاج بھی پیش کرتے ہیں۔ قوم کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچانے کیلئے ایک منظم طریقۂ کار پیش کرتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر نذرالاسلام کے یہاں بانگِ درا اور ضربِ کلیم تو ہیں مگر خضرِ راہ نہیں رابندرناتھ کے یہاں طاؤس و رباب تو ملتا ہے، مگر شمشیر و سناں نہیں ملتی ہاں حکیم الامت ڈاکٹر اقبال کے بانگِ درا بھی ہے۔ ضربِ کلیم بھی ہے اور خضرِ راہ بھی۔ "طاؤس و رباب بھی ہے اور شمشیر و سناں بھی۔

ٹیگور کی شاعری، ان کی تشبیہات و استعارات، ان کے محاوروں اور کہاوتوں میں عام طور پر ہندو تہذیب و تمدن کی ترجمانی ملتی ہے۔ دوسری طرف اقبال نے اپنی شاعری کو صرف اسلامی جذبات و خیالات اور مذہبی واقعات و سانحات کے لئے وقف کردیا۔ مگر نذرالاسلام کی شاعری گنگا۔ جمنا اور دجلہ فرات کا سنگم ہے۔ یہاں ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں کی تہذیب تمدن کی ترجمانی نظر آتی ہے انہوں نے ہر فرد بشر میں اپنے اپنے مذہب کی انقلابی روح پھونک کر اس میں سیاسی اور سماجی شعور پیدا کرنے کی کوشش کی بہرحال تینوں قومی۔ ہیرو کے علمبردار اور آفاق شاعر ہیں۔ قومی تعمیر میں کسی کا حصہ کم نہیں۔ تینوں قومی تعمیر کی صف اولیں میں دوش بدوش نظر آتے ہیں۔ قوم تینوں کی مرہونِ منت ہے اور تینوں کو خراجِ عقیدت پیش کرتی ہے پاک و ہند کی آزادی پر تینوں کا زبردست احسان ہے۔

نذرالاسلام کی تصنیفات

(ایک تعارفی جھلک)

نظمیں :-

۱ - اگنی بینا ــ اس میں بارہ نظمیں ہیں - اور وہ یہ ہیں :-

۱- تباہی کی خوشی، ۲- باغی، ۳- سرخ لباس میں ملبوس ماں (کالی)،
۴- آمد آمد کا گیت، ۵- دھوم کیتو، ۶- کمال پاشا، ۷- الوزا، ۸- طبل جنگ، ۹- شط العرب
۱۰- دریا پار اترنے کی کشتی، ۱۱- قربانی، ۱۲- محرم -

ہر نظم گویا آگ کا ایک ایک شعلہ ہے۔ ہر ایک میں نئی روح، نئی تڑپ اور نئی ہلچل پیدا کرنے کا سامان موجود ہے -

برلن یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر ہیل متھ فن کلا سینپ نے اس کتاب کے متعلق لکھا -

"The poems deserve with full right
the name the author has given them;
They are full of emotion like fire
and sweet like the tune of vina.

طبع اول ــــ ۱۳۲۹ ب (۱۹۲۲ء)
طبع دوم ــــ ۱۳۳۰ ب (۱۹۲۳ء)

۲- دولن چاپنا -

اس میں ۱۹ نظمیں ہیں - ان میں پجاری محبوبہ، گمراہ، درد کا ناز، بے وقت کا بلاوا،

بدعا، امیدوار، محبوبہ، شاعر کی بانی اور آخری التجا بہت اہمیت رکھتی ہیں۔

طبع اول — ۱۳۳۰ ب (۱۹۲۳ء)۔

۳۔ بیشیر بانسٹی

اس میں ۲۷ گیت اور نظمیں ہیں۔ ان کے عنوان یہ ہیں :۔

۱۔ مسز ایم رحمٰن، ۲۔ فاتحہ دوازدہم (ولادت)، ۳۔ فاتحہ دوازدہم (انتقال)۔ ۴۔ خدمت گار، ۵۔ بیداری کا گیت ۶۔ صور کی آواز، ۷۔ بیداری، ۸۔ تنبیہہ، ۹۔ بے خوفی کا پیغام، ۱۰۔ خودی کی قوت، ۱۱۔ قیدی کا گیت، ۱۲۔ مداحی، ۱۳۔ فتنوں موت، ۱۴۔ آزادی طلب رضا کاروں کا گیت، ۱۵۔ زنجیر پہننے کا گیت، ۱۶۔ عہد نو کا گیت، ۱۷۔ آزاد قیدی، ۱۸۔ چرخی کا گیت، ۱۹۔ ذات کی بدذاتی، ۲۰۔ سچا پیغام، ۲۱۔ فتحمندی کا گیت، ۲۲۔ مست مسافر، ۲۳۔ بھوت بھگانے کا گیت، ۲۴۔ لعنت ۲۵۔ باغی کا پیغام، ۲۶۔ آزاد پنجرا، ۲۷۔ جھپٹ۔

یہ مختلف رسالوں میں شائع شدہ گیت اور نظمیں ہیں۔ یہ لاکھوں کروڑوں واماندہ اور مظلوم عوام کے دلوں کی دھڑکنیں ہیں۔ ان گیتوں اور نظموں نے غلامی کی آگ میں جلنے والوں کے خون میں ہیجان پیدا کر دیا۔ شمع آزادی کے پروانوں کو جہاد میں کود پڑنے پر آمادہ کیا۔

طبع اول — ۱۳۳۱ ب (۱۹۲۴ء) حکومتِ وقت نے ضبط کر لی۔

طبع دوم — ۱۳۵۲ ب (۱۹۴۵ء)

۴۔ بھانگار گان

اس میں گیارہ گانے ہیں۔ ان میں توڑ پھوڑ کا گیت، بیداری کا گیت، ترانۂ اتحاد، جارحانہ حکومت کی خونخواری۔ عیدِ شہادت زیادہ اہم ہیں۔

یہ جابرانہ حکومت اور خونخوار سرمایہ داروں کے خلاف اکسانے والے گیتوں کی کتاب ہے۔

طبع اول ۔ ۱۳۳۱ ب (۱۹۲۴ء) طبع اول حکومت نے ضبط کرلی۔
طبع دوم ۔ ۱۹۴۹ء

۵۔ چھاپانٹ

اس میں پچاس نظمیں ہیں۔ ازاں جملہ فتح مند خاتون، جیتی ہوا، آخری نغمہ، آتما کی یاد، جھڑ، دردمند، رخصت کا وقت، امید، شام کا تارا قابلِ ذکر نظمیں ہیں
طبع اول ۔ ۱۳۳۲ ب (۱۹۲۵ء)

۶۔ پوبیر ہوا

یہ کتاب باغی شاعر کے عاشقانہ جذبات کی تصویر ہے
طبع اول ۔ ۱۳۳۲ ب (۱۹۲۵ء)

۷۔ شمّو بادی

یہ ایک طویل نظم ہے۔ اس میں کئی ضمنی نظمیں ہیں یہ نظم لانگل کے پہلے نمبر میں شائع ہوئی۔ بعد میں کتابی شکل میں پیش کی گئی۔ بعد ازاں "سرب ہارا" میں شامل کردی گئی۔
طبع اول ۔ ۱۳۳۲ ب (۱۹۲۵ء)

۸۔ چِتّو نامہ

دیس بندھو چت رنجن داس کی موت پر شاعر کی جو نظمیں اور گیت مختلف اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتے۔ چتو نامہ انہیں کا مجموعہ ہے۔

طبع اول ــ ۱۳۳۲ھ ب (۱۹۲۵ء)

۹۔ سرب بارا

طبع اول ــ ۱۳۳۳ھ ب (۱۹۲۶ء)

اس کتاب میں کل ۱۲ نظمیں ہیں اور وہ یہ ہیں :-

۱۔ بے نوا، ۲۔ کسان کا گیت، ۳۔ مزدور کا گیت، ۴۔ ماہی گیروں کا گیت، ۵۔ طلبا کا گیت، ۶۔ ناخدا ہوشیار!، ۷۔ مساوات کا قائل ــ اسٹور۔ انسان گناہ۔ چور۔ ڈاکو۔ طوائف۔ جھوٹا۔ عورت راجا، پرجا۔ مساوات۔ قلی مزدور، ۸۔ فریاد ۹۔ میری کیفیت، (معذرت) ۱۰۔ مناجات، ۱۱۔ تو تحل ماگ

طبع اوّل۔

شاعر کی مقبول ترین کتابوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ اس کتاب میں غریب، کسان۔ مزدور، چور۔ ڈاکو غرض ہر طرح کے مظلوم انسان کے جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے۔

۱۰۔ فنی منسا

طبع اوّل ــ ۱۳۳۴ھ ب (۱۹۲۷ء)

۱۔ کھانے والے کی گھومنے والی چرخی میں، ۲۔ سرخ جھنڈے کا گیت، ۳۔ جاگتا ہوا صور، ۴۔ ہوشیاری کی گھنٹی، ۵۔ دلی دردمند، ۶۔ بنگال میں مہاتما گاندھی، ۷۔ بین الاقوامی سنگیت، ۸۔ راستے کا چراغ، ۹۔ ہندو مسلم جنگ، ۱۰۔ محنتی مزدور اس کتاب کی قابلِ ذکر نظمیں ہیں۔

اس کتاب کی اکثر نظمیں ہنگامی واقعات اور خاص خاص بلند شخصیتوں سے متعلق ہیں۔

* * *

۱۱۔ سندھو ہنڈول

طبع اوّل ــــ ۱۳۳۴ھ ب (۱۹۲۶ء)

اس کتاب کا بنیادی خیال عشق و محبت ہے۔ اس میں ۱۹ نظمیں ہیں۔ اور ان کے عنوان یہ ہیں۔

۱۔ سندھو ــــ پہلی ترنگ، ۲۔ سندھو ــــ دوسری ترنگ، ۳۔ سندھو ــــ تیسری ترنگ، ۴۔ مخفی محبوبہ، ۵۔ بے نام محبوبہ، ۶۔ رخصت کی یاد میں، ۷۔ راستہ کی یادگار، ۸۔ اُداسی، ۹۔ انتھاہ راستے کا مسافر، ۱۰۔ مفلسی، ۱۱۔ بسنت کا گیت، ۱۲۔ پھاگن کا گیت، ۱۳۔ رسم کی ادائیگی، ۱۴۔ بہو کا استقبال، ۱۵۔ جہیم، ۱۶۔ راکھی بندھن، ۱۷۔ چاندنی رات میں، ۱۸۔ بسنت کا الاپ، ۱۹۔ دروازے پر زنجیر کھڑ کھڑا رہی ہے۔

۱۲۔ جھنگے پھول

طبع اوّل ــــ (۱۹۲۶ء)

یہ بچوں کے لئے لکھی ہوئی نظموں کی کتاب ہے۔ بچوں کے ادب پر بدرالاسلام کا بڑا احسان ہے۔ اس کتاب کی ہر نظم میں بچوں کی توجہ منعطف کرنے کا سامان اور ان کی ذہنی صلاحیت کے فروغ پانے کا سرمایہ موجود ہے۔

۱۳۔ سات بھائی چمپا

یہ بچوں کی ایک طویل نظم ہے۔ طبع اول۔ ؟

۱۴۔ پُتلیر بیٹے ــــ طبع اول ــــ ؟

۱۵۔ زنجیر ـــــ طبع اول ـــ ۱۳۳۵ء ب (۱۹۲۶ء)

اس میں ۱۶ نظمیں ہیں۔ عنوان یہ ہیں:۔

۱ برسات کی سوغات، ۲۔ اگھن کی سوغات، ۳۔ مسز ایم رحمٰن، ۴۔ نقیب، ۵۔ خالد، ۶۔ صبح امید، ۷۔ خوش آمدید، ۸۔ نوروز، ۹۔ نزدل، ۱۰۔ پیش رو، ۱۱۔ عید مبارک، ۱۲۔ آج اہشت میں کون رہے گا، آجا! ، ۱۳۔ زندہ جاوید زغلول، ۱۴۔ امان اللہ، ۱۵۔ عمر فاروق، ۱۶۔ یہ میرا فخر ہے۔

اس کتاب میں زیادہ تر اسلامی خیالات و جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے

۱۶۔ چکرباک ـــ طبع اول ـــ ۱۳۳۳ء ب (۱۹۲۹ء)

اس میں ۲۳ نظمیں ہیں ازاں جملہ ۱۔ تیری یاد آئی، ۲۔ کھڑکی کے پاس چھالیہ کے درختوں کی قطاریں، ۳۔ نرانی بھولی، ۴۔ راہی، ۵۔ یہ میرا فخر ہے، ۶۔ کینہ پرور۔ خاص اہمیت رکھتی ہیں

۱۷۔ سندھیا ـ طبع اول ـ ۱۳۳۶ء ب (۱۹۲۹ء)

اس میں ۲۳ نظمیں ہیں۔ ان میں ۱۔ میں اس کا گیت گاتا ہوں، ۲۔ زندگی کا سمہ سرائی، ۳۔ چل چل چل، ۴۔ سودیس کا اندھا دیوتا، ۵۔ زندگی، ۶۔ راہ راہ، ۷۔ شاعر پیدا کے نام، اس کتاب کی اہم ترین نظمیں ہیں۔

۱۸۔ پرلئے شکھا ـ طبع اول ـــ ۱۹۳۰ء طبع اول حکومت نے ضبط کرلی۔

طبع دوم ـــ ۱۳۵۶ء ب (۱۹۴۹ء)

۱۹۔ نتون چاند ـ طبع اول ـــ ۱۹۴۵ء

اس میں ۷ نظمیں ہیں : ان میں ۱ - ازلی محبوبہ ، ۲ - تومیری شاعری ہے ، ۳ - آنسوؤں کے مٹی بھر پھول ، ۴ - کسانو اٹھو! ، ۵ - شعلہ ، ۶ - آزاد ، خاص اہمیت رکھتی ہے

۲۰ - مَرو بھاسکر -

یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی منظوم سیرت ہے - شاعر نے یہ کتاب ماہنامہ سوغات (۱۳۳۴ء) میں لکھنا شروع کی مگر پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچی - اختتام سے پہلے ہی شاعر کا قلم خاموش ہو گیا اس لحاظ سے یہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے -

طبع اول (نامکمل) ۱۳۶۴ بنگلہ سنہ ب (۱۹۵۷ء)

مشہور بنگلہ ادیب واحد علی نے بھی اسی نام سے رسول کریم صلعم کی سیرت پر بنگلہ نثر میں ایک کتاب لکھی ہے -

۲۱ - شیش سوغات -

اس میں بیالیس نظمیں ہیں - سدا باغی ، عہد نو ، شاعر کی رہائی اس کتاب کی اہم نظمیں ہیں -

طبع اول ــــ ۱۳۶۵ سنہ ب (۱۹۵۸ء)

۲۲ - جھٹ -

طبع اول ــــ ۱۳۶۷ سنہ ب (۱۹۶۰ء)

اس میں زنجیر اور سندھیا کی منتخب نظموں کے ساتھ کچھ نئی نظمیں ، جو اب تک کتابی شکل میں شائع نہیں ہوئی تھیں - شامل کی گئیں -

۲۳ - سنچتا (منتخب) ــــ

یہ شاعر کے منتخب کلام کا مجموعہ ہے
طبع اول ــــ ۱۳۳۵ ب (۱۹۲۸ء)

۲۴۔ سنچین (انتخاب) ــ

یہ شاعر کے چیدہ اور مقبول عام کلام کا مجموعہ ہے
طبع اول ــــ ۱۳۶۲ ب (۱۹۵۵ء)

سنگیت ۔

۱۔ بلبل ۔ (حصہ)

یہ شاعر کی مقبول ترین گانوں کی کتاب ہے۔ جن غزلیہ گانوں کی تخلیق سے انھوں نے نکل سنگیت میں نئے نئے سروں کا اضافہ کیا، ان کا بیشتر حصہ اسی کتاب میں شامل ہے۔
طبع اول ــــ ۱۳۳۵ ب (۱۹۲۸ء)

۲۔ بلبل (حصہ دوم)

اس میں شاعر کے بہت سے جدید گانے شامل ہیں۔ گانوں کی تعداد ۱۰۱ ہے
طبع اول ــــ ۱۳۵۹ ب (۱۹۵۲ء)

۳۔ چوکھیر چاتک ــ

بہ بڑی حد تک غزلیہ گانوں کی کتاب ہے اس میں ۵۱ گانے ہیں۔
طبع اول ــــ ۱۳۳۶ ب (۱۹۲۹ء)

۴۔ چندر بندو ــ اس میں ۶۱ گانے ہیں۔ ان میں ۱۸ گانے طنز و مزاح

کا ہلولے ہوئے ہیں۔ ہر گانے میں نوجوانوں کے دل میں آگ لگا دینے کا سامان موجود ہے۔
طبع اول ــــ ؟ حکومتِ وقت نے ضبط کرلی۔ طبع دوم ۱۳۵۲ھ ب (۱۹۴۶ء)

۵۔ سُرساقی ۔ اس میں ۹۹ گانے ہیں۔ طبع اول ۱۳۳۸ھ ب (۱۹۳۱ء)

۶۔ ذُوالفقار ــــ یہ اسلامی گانوں کی کتاب ہے۔ اس میں ۴۵ گانے ہیں۔
ان گانوں سے نذر الاسلام نے خوابِ غفلت میں پڑے ہوئے مسلمانوں کو جگانے کی کوشش کی۔ مختلف اسلامی ممالک کی بیداری کو دیکھ کر ان کے دل میں اُمید کی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے اپنے ملک کے مسلمانوں سے خطاب کر کے کہا:۔

اے بے خبر تو جاگ اُٹھ۔ تو بھی اپنے دل کا چراغ جلا۔

طبع اول ــــ ۱۳۳۹ھ ب (۱۹۳۲ء)۔

۷۔ بن گیتی ۔
اس کے اکثر و بیشتر گیت شاعر کے عاشقانہ جذبات کے آئینہ دار ہیں۔
طبع اول ــــ ۱۳۳۹ھ ب (۱۹۳۲ء) اس میں ۷۱ گانے ہیں۔

۸۔ گل باغیچہ ۔
اس میں مختلف قسموں کے اٹھاسی گانے ہیں۔ اس کے زیادہ تر گانے میگا فون کمپنی میں ریکارڈ کر لئے گئے ہیں۔
طبع اول ــــ ۱۳۴۰ھ ب (۱۹۳۳ء)

۹۔ گانیر مالا ــــ طبع اول ۱۹۳۴ء

۱۰۔ گیتی ست دل ۔ اس میں ایک سو گانے ہیں۔ یہ گانے ریکارڈ کر لیے گئے ہیں۔
طبع اول ــــ ۱۳۴۱ھ ب (۱۹۳۴ء)۔

۱۱۔ نذرل لپی ــــ طبع اول ۱۳۳۸ھ ب

۱۲۔ سرلپی ـــ طبع اول ـ ۱۹۳۴ء

۱۳۔ سنر مکر ـــ طبع اول ـ ۱۳۴۱ ب (۱۹۳۴ء)

۱۴۔ نذرل گیتکا ۔ یہ گانے کی مختلف کتابوں سے منتخب شدہ گیتوں کا مجموعہ ہے اس میں گیتوں کی تعداد ۱۲۷ ہے۔ اس کے زیادہ تر گانے ہر دلعزیز ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ نذرالاسلام کی مقبول ترین کتابوں میں اگنی بینا، بیشیر بانشی، پرب ہارا، فنی منسا، زنجیر، سندھیا، اور پرلئے شکھا زیادہ تر ان کی باغیانہ ذہنیت اور انقلابی جوش و خروش کی آئینہ دار ہیں۔ ان کے مطالعہ سے سماجی، سیاسی، اور مذہبی نظام کے متعلق شاعر کے خیالات و احساسات کی تصویریں ہماری نگاہ میں پھر جاتی ہیں۔

دولن چاپا، چھایانٹ، پوبر ہوا، سدھو ہندول، چکر باک، چوکھیر چاتک، جل، بن گیتی، شاعر کے عاشقانہ جذبات کی ترجمان ہیں۔ ان کتابوں میں شاعر کے دل میں انسان کی الفت اور فطرت کی محبت کار فرما نظر آتی ہے۔

گل باغیچہ، ذوالفقار، نتون چاند اور مرو بھاسکر زیادہ تر اسلامی جذبات اور روحانی تصورات کی حامل ہیں۔ ان میں قاضی نذرالاسلام نے خدا، رسول، اسلام اور اکابر اسلام سے والہانہ عقیدت و محبت کا اظہار کیا ہے۔

تراجم :-

۱۔ رباعیات حافظ ۔ نذرالاسلام نے حافظ شیرازی کی تمام رباعیات (۷۵) کا منظوم (بنگلہ) ترجمہ کیا۔ آخر میں مختصراً حافظ کے حالات زندگی بھی لکھے طبع اول ۱۳۳۷ب (۱۹۳۰)

۲۔ منظوم پارۂ عم ۔ طبع اول ـــ ۱۳۴۰ ب (۱۹۳۳ء)

اس کے مقدمہ میں نذرالاسلام لکھتے ہیں میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ میں قرآن پاک کا منظوم ترجمہ کروں اگر عربی اور بنگلہ دونوں زبانوں میں ہر کوئی آدمی اس طرف متوجہ ہوتا تو میں ہرگز قرآن شریف جیسی عظیم ترین کتاب کا ترجمہ

کرنے کی جرأت نہ کرتا اور اس کی ضرورت بھی پیش نہ آتی ۔

آج مجھ سے زیادہ صالح آدمی اگر قرآن مجید، حدیث اور فقہ وغیرہ کے بنگلہ ترجمہ کرنے پر آمادہ ہو جائے تو صرف بنگالی مسلمان نہیں بلکہ ساری دنیا کے مسلم سماج پر اس کا بے حد احسان ہوگا ۔ ۔ مجھے یقین ہے کہ اگر قرآن شریف کا منظوم ترجمہ آسان بنگلہ میں ہو جائے تو زیادہ تر مسلمان اُسے آسانی سے حفظ کر سکیں گے ۔"

عرضِ گذار ۔ نذر الاسلام، اگست ۱۹۳۲ء

رباعیاتِ عمر خیام — اس میں شاعر نے براہِ راست عمر خیام کے فارسی کلام سے ۱۹۸ رباعیات کا منظوم ترجمہ پیش کیا ۔ طبع اول — سنہ ۱۹۶۰ء

افسانے :-

۱۔ بیتھار دان — طبع اول — سنہ ۱۳۲۹ ب (سنہ ۱۹۲۲ء) یہ چھ مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے ۔ افسانوں کے عنوان یہ ہیں :- ۱۔ درد کا احسان، ۲ حنا، ۳ بادل کی بارش میں، ۴۔ نیند کے خمار میں، ۵۔ بر نہ آئی ہوئی آرزوئیں، ۶۔ سپاہی نظر بند کا خط ۔

۲ ۔ رکتیر بیدن : طبع اول ۔ سنہ ۱۹۲۵ء ۔ یہ آٹھ مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے ۔ افسانوں کے عنوان یہ ہیں ۔ ۱۔ محرومی کا درد ، ۲۔ آوارہ کی آپ بیتی، ۳۔ مہر نگار ، ۴۔ شام کا ستارہ ، ۵۔ چڑیل ، ۶۔ سالک ، ۷۔ گم کردہ شوہر ۸۔ نہ تھکنے والا مسافر ۔

۳ ۔ سیولی مالا ۔ طبع اول ۔ سنہ ۱۹۳۱ء ۔ یہ چار مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے ۔ افسانوں کے عنوان یہ ہیں :- ۱۔ پدموگوکھرو (ایک قسم کا زہریلا سانپ) ، ۲ شاہ جن ۳۔ جوالا مکھی ، ۴۔ سیولی مالا ۔

ناول :-

۱ ۔ باندھن ہارا (بے قید) — یہ نذر الاسلام کا پہلا ناول ہے ۔ سیکھ

۱۳۲۶ھ (۱۹۲۰ء) سے 'مسلم بھارت' میں قسط وار شائع ہوا۔ ساون، ۱۳۳۴ھ (۱۹۲۷ء) میں پہلی دفعہ کتابی شکل میں شائع ہوا۔ یہ ایک اصلاحی ناول ہے۔ نورالہدیٰ اس کا ہیرو ہے۔ وہ بے قید زندگی کا ترجمان ہے۔ یہ کردار نذرالاسلام کی زندگی اوران کی فطرت کا آئینہ دار ہے۔ اس لئے یہ کتاب شائع ہوتے ہی لوگ انہیں باندھن ہارا نذرالاسلام کہنے لگے۔

۲۔ مرتو کھدا (موت کی بھوک)۔ طبع اول ۱۳۳۶ھ ب (۱۹۳۰ء)۔

یہ ناول ماہانہ سوغات میں قسط وار شائع ہوا۔ بعدازاں کتابی شکل میں پیش کیا گیا۔ کرشنانگر (ندیا) کے دوران قیام میں نذرالاسلام نے وہاں کے واقعات کے پیش منظر ناول لکھا۔ اس کتاب نے بنگلہ ادب میں ایک ہلچل مچادی۔ تحریک خلافت اور ترک والات کے زمانے میں یہ کتاب لکھی گئی۔ اس ناول میں نذرالاسلام نے عوام کی اُمید و یاس کے جذبات کو فنکارانہ طور پر بیان کیا۔ ایک دولت مند مسلم گھرانے کا نوجوان ——— انصار اس ناول کا ہیرو ہے۔ اس کتاب میں ایک عاشقیہ کہانی کے ذریعے لوگوں میں سیاسی اور سماجی بیداری کرنے کی کوشش کی گئی۔

۳۔ کُہیلکا (شبنم) ——— اس کا ہیرو جہانگیر ایک انقلابی نوجوان اور ملک کی جنگِ آزادی کا ایک پیشہ ور سپاہی ہے۔ اس کردار کے توسط سے نذرالاسلام نے مسلمان نوجوانوں کو جنگِ آزادی کی دعوت دی۔ یہ ناول اولاً ماہانہ نوروز پھر ہفتہ وار سوغات میں قسط وار شائع ہوا۔ بعدازاں کتابی شکل میں پیش کیا گیا۔ طبع اول ۱۹۳۱ء۔

ناٹک:-

۱۔ جھلی ملی ——— یہ ایک ایکٹ کے چار چھوٹے چھوٹے ناٹکوں کا مجموعہ ہے۔
طبع اول ——— ۱۹۳۰ء۔

۲۔ آلیا۔ (WILL-O'-THE WISP)۔ یہ گیتی ناٹک ہے۔ اس میں تیس گانے ہیں۔ پہلے اس کا نام مروترشنا تھا۔ بعد میں آلیا رکھا گیا۔ اس کتاب کی کہانی

کا ایک حصہ ہندو پُران سے مستعار ہے۔ طبع اول ۱۳۳۸ھ ب (۱۹۳۱ء)

۳۔ مدھومالا ۔ یہ تین ایکٹ کا گیتی ناٹک ہے۔ طبع اول ۱۳۶۶ب (۱۹۵۹ء)

مقالات :-

۱۔ جوگ بانی ۔ یہ نوجوگ کے ۱۲ اداریتی مقالوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں آتش فشاں زبان میں حکومت کے خلاف احتجاج کیا گیا۔ اس لئے حکومتِ وقت نے اسے ضبط کر لیا۔

طبع اول ۔ ۱۹۲۲ء

طبع دوم ۔ ۱۳۵۶ ب (۱۹۴۹ء)

۲۔ راج بندیر زبان بندی

یہ ایک رسالہ ہے۔ جو نذرالاسلام نے حکم قید سے پہلے نظربندی کی حالت میں عدالت میں بیان دینے کے لئے لکھا (۷ جنوری ۱۹۲۳ء)

طبع اول ۔ ۱۹۲۳ء

۳۔ رودر منگل ۔ یہ کتاب سرکار نے ضبط کر لی۔ یہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ طبع اول ۔ ؟ ۔ یہ مضامین پہلے دھوم کیتو میں شائع ہوئے۔ بعد میں کتابی شکل اختیار کر گئے۔

۴۔ دردنیر جاتری

یہ کتاب بھی دھوم کیتو میں شائع شدہ چند مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کے ہر صفحہ، ہر سطر میں مردہ قوم کی رگِ حمیت میں خون دوڑانے کا جوش و جذبہ موجود ہے۔ نذرالاسلام نے کہا :-

کہہ دے ۔ کسی کی غلامی نہیں مانتا ہوں۔ نہ اپنے دیسی کی نہ بدیسی کی جو رسوا کرتا ہے۔ اس سے بزدل وہ ہے جو رسوائی کو برداشت کر لیتا ہے۔ تیرا

قومی بیدار ہو جائے، تو دنیا میں ایسی کوئی طاقت نہیں جو تجھے پاؤں سے روند سکے۔

طبع اول ۔ ۱۳۴۳ ب (۱۹۲۶ء)

۵ - دھوم کیتو۔

یہ دھوم کیتو اور دوسرے اخباروں میں شائع شدہ چند مضامین اور خطوط کا مجموعہ ہے۔

طبع اول ۔ ۱۳۶۷ ب (۱۹۶۰ء)

جو اخبار ان کے زیر ادارت تھے:-

۱ - روزانہ نوجوگ -

(۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۵ء)

۲ - دھوم کیتو -

(۱۹۲۲ء ہفتہ وار - سہ روزہ - پندرہ روزہ

جو اخبار ان کے زیر ہدایت تھے۔

۱ - لانگل -

(ہفتہ وار) ۱۹۲۵ء)

کئی شماروں کے بعد اس کا نام "گنبانی" رکھا گیا۔ "گنبانی" کا پہلا شمارہ ۱۲ اگست ۱۹۲۶ء کو شائع ہوا۔

۲ - ماہانہ نوروز،

۱۳۳۴ ب -

٭